egd. L. NO.7243 Phon

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1970

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیّت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

بدلِ اشتراک
پاکستان: سالانہ ——— دس روپے
ہندوستان: سالانہ ——— پندرہ روپے
غیر ممالک: سالانہ ——— ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان ——— ایک روپیہ
ہندوستان
ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵-بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد ۲۳ | جولائی۔ سنہ ۱۹۷۰ء | نمبر ۷

فہرست

(۱) ـــ لمعات ——— ۳
(۲) ـــ وقف کی دینی حیثیت ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲۷
(۳) ـــ علمائے کرام۔ امام غزالیؒ کی نگاہ میں ——— (محترم رفیع اللہ صاحب) ——— ۳۳
(۴) ـــ انقلابی عربوں کا عالمی کردار ——— (محترم خورشید عالم صاحب) ——— ۴۹
(۵) ـــ شیر آیا، شیر آیا۔ بالآخر کب تک؟ ——— ۵۸
(۶) ـــ طلوعِ اسلام کا سبق ——— (محترم عبدالحکیم خاں صاحب مرحوم) ——— ۷۳
(۷) ـــ باب المراسلات ——— (زمانے کے تقاضے اور قرآن) ——— ۷۷
(۸) ـــ حقائق و عبر ——— (صحیح علاج) ——— (دو گا اس نرود پشیماں کا پشیماں ہونا) ——— ۸۰

ایڈیٹر۔ محمد خلیل، ناشر سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر شیخ محمد اشرف، مطبوعہ۔ اشرف پریس، ایبک روڈ۔ لاہور

سنہ ۱۹۳۸ء نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

سنہ ۱۹۴۷ء نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

نفرت

سنہ ۱۹۷۰ء نفرت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کی فضا اِسقدر نفرت انگیز کیوں ہے؟

(ایک حقیقت کشا سنجیدہ تجزیہ)

پاکستان کی سیاست حاضرہ پر اگر کوئی شخص دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اس وقت پاکستان کی فضا، باہمی نفرت اور عداوت کے جذبات سے معمور ہے اور جب جذبات نفرت اور عداوت کی وسعت اور شدت کا یہ عالم ہو تو اس قوم سے اس کی توقع کرنا بیکار ہے کہ وہ کسی معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچ اور بچار کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے گی۔

نفرت کے جذبات یکطرفہ ٹریفک نہیں ہوتے، جب کبھی ایک طرف سے نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے تو فریق مخالف کا ردّ عمل بھی ایسا ہی ہوتا ہے (بجز اس کے کہ وہ فریق اخلاق عالیہ کی اتنی بلندیوں تک پہنچ چکا ہو کہ وہ جذبات کی شدت میں بھی، بلند اقدار سماوی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے) اس طرح باہمی نفرت اور عداوت کا ایک ایسا دائرۂ اسور (VICIOUS CIRCLE) وجود میں آجاتا ہے جس میں ایک جذبہ اسی قسم کے دوسرے جذبہ کو جنم دیتے چلا جاتا ہے اور ساری قوم اس زہر آلود فضا میں سانس لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ بہی خواہان پاکستان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان جذبات نفرت وعداوت کے سرچشمہ کا سراغ لگائیں اور پھر کوشش کریں کہ کسی طرح وہ بند ہو جائے تاکہ اس بدقسمت سرزمین کی فضا اعتدال پر آجائے۔ ان سطور کی تحریر کا جذبہ محرکہ یہی ہے۔

یوں تو ہمارے ملک میں (یعنی تقسیم سے پہلے) مذہبی فرقوں میں باہمی اختلاف بھی تھا اور سیاسی پارٹیوں میں کشمکش بھی لیکن نفرت اور حقارت کے اس دور کی ابتداء ۱۹۳۹ء سے ہوئی جب سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے اپنے ان مضامین کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ وہ دن اور

آج کا دن ـــــ یہی نہیں کہ یہ لہر کہیں تھمی یا رکی نہیں بلکہ جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اس کی رفتار میں تیزی اور تندی میں شدت آتی چلی گئی تا آنکہ اب اُس نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

تاریخ کی یہ ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ جب کوئی شخص کسی طرح اثر یا اقتدار حاصل کر لیتا ہے تو اُس کی ذاتی نفسیات کا رنگ اُس کے پورے حلقۂ اقتدار یا اثر پر چھا جاتا ہے۔ اور اگر اُس شخصیت کو مذہبی تقدس بھی حاصل ہو جائے تو پھر اُس کی یہی نفسیاتی خصوصیات مذہبی زندگی کا منتہیٰ و مقصود قرار پا جاتی ہیں۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ اگر وہ ذی اثر اور صاحب اقتدار شخصیت بلند اقدار کی پیکر ہوتی ہے تو اُس کے زیرِ اثر جماعت بھی انہیں اقدار کے رنگ میں رنگی جاتی ہے۔ لیکن اگر اُس کی ذات متوازن نہیں ہوتی، وہ کسی قسم کے سیاسی گرداب (COMPLEXES) میں گھری ہوتی ہے تو اُس کا زیرِ اثر حلقہ بھی انہیں احساسات کا شکار ہو جاتا ہے اور بدقسمتی یہ کہ وہ انہیں سیرت و کردار کا بلند معیار قرار دے دیتا ہے۔

گزشتہ تیس برس سے مودودی صاحب کا جو کردار لوگوں کے سامنے آیا ہے اُس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اُن میں انتہا درجے کی رعونت، تکبر، نخوت، خود پسندی، ہمچوں ما دیگرے نیست کا احساس کبریٰ انا الموجود وغیری کی آمرانہ ذہنیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ (سوائے اُن لوگوں کے جو اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں) ہر ایک کو ذلت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنے مصاحبین کو بھی اُس وقت تک برداشت کرتے ہیں جب تک ان کی روش یہ ہو کہ ـــــ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔

قارئین کو معلوم ہے کہ ہم کبھی ذاتیات میں نہیں الجھا کرتے۔ اس لئے مودودی صاحب کے اس نفسیاتی تجزیہ کے لئے بھی ہم اپنی ذاتی معلومات کو درمیان میں نہیں لائیں گے بلکہ انہی شہادات کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو اس سے پہلے پبلک کے سامنے آ چکی ہیں۔ انہوں نے اپنے بچپن کی زندگی کے متعلق خود کچھ ایسی باتیں بتائی ہیں جن سے اُن کی نفسیاتی ذہنیت کی بنیاد ابھر کر سامنے آ جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

بچپن کی زندگی

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا، میرے ایک بھائی مجھ سے تین چار برس بڑے تھے۔ مجھے کھانے کی جو چیز ملتی تھی اُسے میں فوراً کھا لیتا تھا مگر بھائی سنبھال کر کسی اچھے وقت پر کھانے کے لئے اٹھا رکھتے تھے۔ اس طرح جو پیسے ملتے تھے اُن کو بھی میں فوراً خرچ کر ڈالتا تھا اور بھائی صاحب انہیں جمع کر کے کوئی اچھی چیز خرید لاتے۔ بس یہ میرے اور اُن کے درمیان جھگڑے کی مستقل بنیاد تھی۔ میں ہمیشہ اُن کے حصے میں سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتا اور وہ ہمیشہ تھوڑی دیر مقابلہ کرنے کے بعد کچھ نہ کچھ میرے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور اس طرح والدین کے حصے میں

سے میں پچھتر فیصد کا مالک ہوتا تھا پچاس فیصد اپنے حساب میں اور پچیس فیصد اپنے بڑے بھائی کے حساب میں۔ (ماہنامہ چراغ راہ۔ جولائی ۱۹۵۳ء)

اس سے آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

مجھے سب سے زیادہ لطف اُس وقت آتا تھا جب میں بیمار ہوتا تھا جب مجھے کوئی چوٹ لگ جاتی تھی اور میرے والدین میرے لئے پریشان ہوتے تھے۔ اس لطف کی خاطر میں اپنے آپ کو کبھی جان بوجھ کر بھی خطرے میں ڈالتا۔ (ایضاً)

فطرۃً خود مختار

مودودی صاحب کی اس بنیادی نفسیات نے اُن کی کیا سرشت بنا دی، اس کے متعلق وہ اپنے خود نوشت حالات میں لکھتے ہیں۔

قدیم تعلقات کی بنا پر مجھے الجمعیت کو ہمدرد پر ترجیح دینی پڑتی۔ اس کے علاوہ ترجیح کی دوسری وجہ یہ تھی کہ میں فطرۃً خود مختاری کو پسند کرتا ہوں اور کسی دوسرے شخص کے ماتحت کام نہیں کر سکتا، خواہ وہ میرے نزدیک کتنا ہی محترم ہو۔

(مولانا مودودی اپنوں اور دوسروں کی نظر میں)

اس ذہنیت نے مودودی صاحب کو بزعم خویش کس مقام پر پہنچا دیا، اس کے متعلق اُن کے بڑے بھائی مولانا ابو الخیر مودودی صاحب کی رائے قابل غور ہے۔ بات یوں ہوئی کہ ماہنامہ نگار پاکستان نے نیاز نمبر نکالنے کے سلسلے میں ملک کے اُن مختلف ارباب قلم کو دعوت نگارش دی، جنہیں کسی نہ کسی جہت سے جناب نیاز سے تعلق یا دلچسپی تھی۔ ان میں ابو الاعلیٰ مودودی اور ابو الخیر مودودی کا نام سرنہرست آتا تھا۔ کیونکہ انہوں نے بقول مولانا ابو الخیر۔ قلم پکڑنا حضرت نیاز کی حاشیہ نشینی میں سیکھا تھا۔ ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے اس فرمائش کے جواب میں کیا لکھا اور جناب نیاز نے اس پر کیا تبصرہ فرمایا، یہ ایک الگ داستان ہے۔

شاھد من اھلھا

مولانا ابو الخیر صاحب سے کہا گیا تھا کہ وہ نیاز صاحب کی بھوپال کی زندگی سے متعلق کچھ لکھیں۔ انہوں نے اس کے جواب میں لکھا۔

جی ہاں! نیاز اور بھوپال پر لکھنے والا ہی ایک نافرجام رہ گیا ہے کاش..... ! تم کو مرحوم ہوئے ایک زمانہ بیت گیا۔ ابو الاعلیٰ "بعد از خدا بزرگ" ہو گئے۔ اور یہ نافرجام.....

(نگار پاکستان ۱۹۶۳ء صفحہ ۶۳)

ہم سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کی ذہنیت، افتاد طبیعت اور نفسیات کے متعلق اس سے صحیح تر تبصرہ اور ہو نہیں سکتا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مودودی صاحب کسی بڑی سے بڑی ہستی کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم نے جب

"بڑی سے بڑی ہستی" کہا ہے تو سمجھ سوچ کر کہا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں کون کون سی ہستیاں آجاتی ہیں۔

(۵)

حضورؐ رسالتمآبؐ کی شان میں

عالم انسانیت میں حضور نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کا جو مقام ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ۔۔۔ حضورؐ اور صرف حضورؐ ہی کی نسبت کہا گیا ہے اور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ دیکھئے کہ مودودی صاحب اس ذاتِ اقدس و اعظم کے متعلق کن خیالات کا اظہار فرماتے ہیں ۱۹۵۸ء کا ذکر ہے کہ جماعتِ اسلامی کے بعض سرکردہ کارکن ۔۔۔ جن میں مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن جیسے زعما بھی شامل تھے جو ایک وقت میں امیر جماعت بھی رہ چکے تھے ۔۔۔ جماعت سے الگ ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ مودودی صاحب نے جو اصول جماعت کی تشکیل کے زمانے میں اختیار کئے تھے اب اصولِ اقتدار کے وقت وہ اُن میں سے ایک ایک اصول کو توڑتے چلے جاتے ہیں اور اس کے جواز میں کہتے یہ ہیں کہ اقامت دین کا تقاضا حکمت عملی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جس اصول کو جی چاہے عند الضرورت توڑ دو۔ جب اُن سے کہا گیا کہ یہ کس قسم کا اسلام ہے جس کی آپ دعوت دے رہے ہیں تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس روش پر نادم ہوتے آپ کلیجے پر ہاتھ رکھ کر سنیئے کہ انہوں نے کیا کہا۔ انہوں نے کہا (توبہ توبہ استغفر اللہ، نقل کفر کفر نہ باشد) کہ میں نے اگر حکمت عملی کے تابع اصول شکنی کی ہے تو یہ کون سی نئی بات ہے خود رسول اللہ نے بھی ایسا کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا ہے اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من القریش، امام قریش میں سے ہوں۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت مساوات کے اُس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ چہارم صفحہ ۳۰-۳۲۹)

معترضین نے یہ بھی کہا تھا کہ میدانِ سیاست میں آپ جھوٹ اور فریب تک کو جائز قرار دے دیتے ہیں۔ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے تو یہ فتویٰ صادر فرمایا کہ

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضروریات ایسی ہیں، جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

اور اس کے بعد پھر اسی ڈھٹائی سے جسے دہراتے ہوئے ہمارا کلیجہ کانپتا ہے، یہ کہا

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں، کعب بن اشرف کے قتل کے لئے جب محمد بن مسلمہ کو حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح اس کی اجازت دی۔

(ترجمان القرآن۔ بابت مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۵۵۔ ۵۶)

کہہ دیا جائے گا کہ یہ واقعات کتب روایات میں موجود ہیں، اس لئے مودودی صاحب نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کی۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان باتوں کا ذکر کتب روایات میں آیا ہے لیکن روایات (احادیث) کے معاملہ میں مودودی صاحب کا مسلک مختلف ہے۔ ایک اہلحدیث اس کا مکلف ہے کہ بخاری اور مسلم میں جو احادیث آئی ہیں انہیں بلاتنقید صحیح تسلیم کرے اور دیگر کتب احادیث میں سے جو حدیثیں صحیح قرار پا چکی ہیں انہیں اسی طرح قبول کرے۔ لیکن مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ وہ اس باب میں کسی کے فیصلے کے پابند نہیں، وہ ہر حدیث پر تنقید کر سکتے ہیں اور صرف اُن احادیث کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں جنہیں اُن کی بصیرت صحیح قرار دے دے۔ ظاہر ہے کہ اس مسلک کے ماتحت وہ اس کے پابند نہیں تھے کہ ان احادیث کو بلاتنقید قبول کر لیں۔ انہوں نے ان احادیث کو اس لئے اپنی تائید میں پیش کیا ہے کہ اُن کے نزدیک یہ احادیث صحیح ہیں۔

ارباب علم کو معلوم ہے کہ ہمارے کتب روایات میں صحیح روایات بھی ہیں اور غلط بھی۔ مودودی صاحب کی کیفیت یہ ہے کہ وہ پہلے ایک مسلک اختیار کرتے ہیں اور پھر کتب روایات میں سے چُن چُن کر وہ روایات نکال لیتے ہیں جو اُن کے مسلک کی تائید کرتی ہوں، خواہ اصول حدیث کے مطابق وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ یہی کچھ انہوں نے زیر نظر معاملہ میں بھی کیا۔ اصولوں کو توڑا، سیاست میں جھوٹ بولنے اور فریب دینے کو روا رکھا۔ جب اس پر اعتراض کیا گیا تو بجائے اس کے کہ اس پر شرماتے، وہ وضعی حدیثیں چُن کر لے آئے جو اُن کے مسلک کی تائید کرتی ہیں اور انہیں قطعاً اس کا احساس نہ ہوا کہ وہ اس سے اُس ذاتِ اقدس و اعظم کی کس منتم کی تصویر دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، جن کے خلقِ عظیم کی شہادت خود خدا نے دی۔

آپ نے دیکھا کہ جذبۂ رعونت اور نخوت انسان کو کہاں پہنچا دیتا ہے۔

صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کی تضحیک

ذاتِ رسالت مآبؐ کے بعد صحابہ کبارؓ کا مقام ہے ۔۔۔ وہ صحابہ کبارؓ جن کے مومن حقہ ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی ہے۔ لیکن یہ لکھتے ہوئے انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کی رعونت نے اُن ہستیوں کو بھی نہیں بخشا۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد پہلے الیکشن کے زمانے میں مودودی صاحب نے محسوس کیا کہ اُن کی جماعت کو انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لہذا انہوں نے اعلان فرمایا کہ انتخابات میں شرکت سرے سے خلافِ اسلام ہے۔ انہوں نے لکھا۔

> اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔ اسی بنا پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریقِ انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔ جماعتِ اسلامی نہ اپنے پارٹی ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی، نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لئے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر، یہی نہیں بلکہ جماعت اپنی انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام الناس کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ ایسا آدمی جب کبھی اور جہاں کہیں سامنے آئے، لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔ اس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کانٹے بونا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن ۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس پر ان کے خلاف یہ اعتراض ہوا کہ اگر کسی منصب کے لئے، امیدوار بن کر کھڑے ہونا اسلام کے خلاف ہے تو حضرت علیؓ نے اپنے آپ کو منصب خلافت کے لئے کیوں پیش کیا تھا۔ اس پر انہیں سوچنا چاہیئے تھا کہ میں نے واقعی ایک غلط بات کہی ہے اور اس کے بعد اس سے رجوع کر لینا چاہیئے تھا۔ لیکن ان کا جذبۂ رعونت انہیں اس کی اجازت کب دے سکتا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس کے جواب میں کیا کہا۔ سنیئے اور پھر کلیجہ تھام کر سنیئے کہ یہ کچھ خلیفۂ راشد حضرت علیؓ کے متعلق کہا جا رہا ہے۔ انہوں نے لکھا۔

> آخری فیصلہ کن بات اس مسئلہ میں یہ ہے کہ اگر صحابہ کرامؓ یا بزرگانِ سلف میں سے کسی کا عمل ایک طرف ہو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے صاف صاف ارشادات دوسری طرف تو ہمارے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں کہ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو چھوڑ کر کسی

بزرگ کے عمل کو اپنے لئے قانونِ زندگی قرار دیں جس کا جو عمل بھی فرمانِ خدا اور رسول سے مختلف ہو وہ ایک لغزش ہے نہ کہ حجت۔ ان بزرگوں کی خوبیاں اور خدمات تو اتنی زیادہ تھیں کہ ان کی لغزشیں معاف ہو جائیں گی مگر ہم سے زیادہ بدقسمت کون ہو گا اگر ہم اپنے گناہوں کے ساتھ اگلے پچھلے بزرگوں کی لغزشیں بھی چن چن کر اپنی زندگی میں جمع کر لیں۔"

(ترجمان القرآن بابت اکتوبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۸)

آپ نے غور فرمایا کہ مودودی صاحب نے کیا کہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے (معاذ اللہ) خدا اور رسولؐ کے صاف صاف ارشادات کی خلاف ورزی کر کے ایک لغزش کی تھی۔ میں اس قسم کی لغزش نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ کے متعلق تو یہ کہا اور جب ۱۹۵۵ء کے دستور کے تابع منعقد ہونے والے انتخابات کے متعلق اندازہ ہوا کہ اُس میں ان کے اُمیدوار کامیاب ہو سکتے ہیں تو انہوں نے اپنی سابقہ پالیسی بدلی اور فیصلہ کیا کہ وہ انتخابات میں حصہ لیں گے۔ اس مقام پر آپ کو یہ خیال پیدا ہوا ہو گا کہ مودودی صاحب نے اس فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہو گا کہ انہیں بے حد ندامت ہے کہ انہوں نے پہلے ایک غلط بات اسلام کے سر تھوپ دی اور حضرت علیؓ کی شان میں بھی گستاخی کی۔ اس کے لئے وہ خدا اور قوم سے معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن مودودی صاحب کی رعونت اس کی کب اجازت دے سکتی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے اس نئے فیصلے کا اعلان کن الفاظ کے ساتھ کیا۔ ان الفاظ کے ساتھ کہ

ہر معقول آدمی بیک نظر محسوس کرے گا کہ ہماری یہ نئی پالیسی ٹھیک ٹھیک دینی نظام کے مطابق ہے اور اس میں ما اصل کوئی اصول شکنی نہیں کی گئی۔

(ترجمان القرآن۔ مئی ۱۹۵۸ء)

یعنی ان کا اب یہ فیصلہ کہ کسی منصب کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا عین دینی نظام کے مطابق تھا لیکن حضرت علیؓ کا اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش کرنا خدا اور رسول کے واضح ارشادات کی خلاف ورزی اور بہت بڑی لغزش تھی۔ واضح رہے کہ اب جماعتِ اسلامی آئندہ الیکشن میں ایک ایک نشست کے لئے امیدوار کھڑے کرنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

———— (۰) ————

حضرت عثمانؓ کے خلاف

مودودی صاحب کے تیرِ تنقید کا ہدف صرف حضرت علیؓ کی ذات نہیں تھی، ان کے ناوک نے کسی صید کو بھی نہیں چھوڑا۔ انہوں نے ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۵۱ء و جنوری ۱۹۵۲ء میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا "تجدید و احیائے دین" — بعد میں

اسے کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا گیا تھا۔ اس کا ذیلی عنوان تھا۔ "مجددین امت کے کارناموں پر ایک تنقیدی نظر"۔ ان مجددین میں جنہیں مودودی صاحب نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا تھا خلفائے راشدین بھی شامل تھے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے دورِ خلافت کے متعلق لکھا تھا۔

> مگر ایک طرف حکومتِ اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا اور دوسری طرف حضرت عثمان رضؓ جن پر اس کارِ عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیشرووں کو عطا ہوئی تھیں اس لئے جاہلیت کو اسلامی نظامِ اجتماعی کے اندر گھس آنے کا راستہ مل گیا۔ حضرت عثمان رضؓ نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا۔ ان کے بعد حضرت علی رضؓ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تصرف سے بچانے کی انتہائی کوشش کی لیکن اُن کی جان کی قربانی بھی اس انقلابِ معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر کار خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کا دور ختم ہو گیا۔ (صفحہ ۳۵)

حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کی اس ناکامی کا ذکر کرنے کے بعد وہ مجددین کی طرف آتے ہیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، ائمہ اربعہ، امام ابن تیمیہ، امام غزالی، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ (رحمہم اللہ) میں سے ایک ایک کا نام لے کر یہ بتاتے ہیں کہ یہ حضرات اپنے مشن میں کس طرح ناکام رہ گئے۔ اس کے بعد وہ قوم سے کہتے ہیں کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ایک آنے والا آئے گا اور جو کچھ ان اسلاف میں سے کسی سے نہیں ہو سکا وہ کچھ کر کے دکھلائے گا۔ وہ لکھتے ہیں۔

آنے والا

> میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والا اپنے زمانے میں بالکل جدید ترین طرز کا لیڈر ہوگا۔ وقت کے تمام علومِ جدیدہ پر اُس کو مجتہدانہ بصیرت حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائلِ مہمہ کو خوب سمجھتا ہوگا۔ عقلی و ذہنی سیاست، سیاسی تدبر، جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام دنیا پر اپنا سکہ جما دے گا اور اپنے عہد کے تمام جدیدوں سے بڑھ کر جدید تر ہوگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے۔ پھر مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اپنی جسمانی ساخت میں وہ عام انسانوں سے کچھ بہت مختلف ہوگا۔ اُس کی علامتوں سے اُس کو تاڑ لیا جائیگا۔
>
> . . . . . وہ خالص اسلام کی بنیادوں پر ایک نیا مذہبِ فکر پیدا کرے گا۔ ذہنیتوں کو بدلے گا اور ایک زبردست تحریک اٹھائیگا جو بیک وقت تہذیبی بھی ہوگی اور

سیاسی بھی۔ جاہلیت اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ اس کو کچلنے کی کوشش کرے گی۔ مگر بالآخر وہ جاہلی اقتدار کو الٹ کر پھینک دے گا اور ایک ایسا زبردست اسلامی اسٹیٹ قائم کرے گا جس میں ایک طرف اسلام کی پوری روح کارفرما ہوگی اور دوسری طرف سائنٹیفک ترقی اوجِ کمال تک پہنچ جائے گی۔

(ایسا ہوگا "آنے والا مہدی")۔ (صفحات ۵۴ ۵۵)

اگر اس کے بعد بھی آپ پہچان نہ سکیں کہ وہ "مہدی آخرالزمان" کون ہے تو آپ کی کورنگہی کا کیا علاج!

(۷)

مزاجِ شناسِ رسولؐ مودودی صاحب نے اپنے لئے جو مقام اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا ہے۔ اور وہ مقام ہے "مزاج شناسِ رسولؐ" کا۔ مزاج شناسِ رسولؐ کے اختیارات کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ لاکھوں کی تعداد کے ذخیرہ احادیث میں سے جس کے متعلق وہ کہدے کہ وہ صحیح ہے اُسے صحیح تسلیم کرنا ہوگا، اور جسے وہ غلط کہدے، اُسے غلط ماننا پڑے گا۔ یہی نہیں بلکہ

جن مسائل میں اُس کو قرآن وسنت سے کوئی چیز نہیں ملتی، اُن میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے۔ یہ اس لئے کہ اُس کی رُوح، روحِ محمدی میں گم اور اُس کی بصیرت، بصیرتِ نبوی کے ساتھ متحد ہوجاتی ہے۔ اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ یہ انسان اسناد کا زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوسکتا۔　　　　(تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۳،۲۴)

یہ ہے مقام مزاج شناسِ رسولؐ کا۔ یعنی تمام جامعین احادیث و رواۃ اور ائمہ اسماء الرجال سے بلند تر مقام جس کی نگہ بصیرت یہ بتلائے گی کہ آج رسول اللہ ہوتے تو وہ اس معاملے میں یوں فرماتے۔ اور آپ کو شاید یاد ہوگا کہ منیر کمیٹی کے سامنے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مزاج شناسِ رسول خود مودودی صاحب ہیں۔ اور ماہنامہ فاران نے اپنی جون ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں لکھا تھا۔

کوئی شک نہیں کہ مودودی صاحب کی شخصیت امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مودودی صاحب نے نومبر ۱۹۵۱ء میں اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ ان کی اطاعت درحقیقت خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہے۔

> اسلامی نقطۂ نظر سے اقامتِ دین کی سعی کرنے والی جماعت میں جماعت کے اولی الامر کی اطاعت فی المعروف عین اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کا ایک جزو ہے۔ جو شخص اللہ کا کام سمجھ کر یہ کام کر رہا ہے اور اللہ ہی کے کام کی خاطر جس نے کسی کو امیر مانا ہے وہ اُس کے جائز احکام کی اطاعت کر کے دراصل اُس کی نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے۔
>
> (ہدایات۔ صفحہ ۳۷)

آپ نے یہ دیکھ لیا کہ مودودی صاحب اپنے آپ کو کس طرح مجددین اور ائمہ حدیث اور ائمہ فقہ سے بلند سمجھتے ہیں۔ جہاں تک تفسیر قرآن کریم کا تعلق ہے وہ متقدمین یا متاخرین ائمہ تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں کہ

> میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا اُن کے بیانات سے اطمینان نہیں ہوتا تو خود غور و فکر کر کے رائے قائم کرتا ہوں۔
>
> (رسائل و مسائل جلد دوم۔ صفحہ ۱۶۷)

(۰)

پنجاب میں آکر یہ تھی وہ ذہنیت جسے لئے ہوئے مودودی صاحب ۳۷-۱۹۳۶ء میں حیدرآباد دکن سے پنجاب کی طرف تشریف لائے اور اپنے ان مقالات کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں سیاسی کشمکش حصہ سوم کے نام سے کتابی شکل میں سامنے آیا۔ اس وقت ملکی سیاست کی کیفیت یہ تھی کہ قومیت پرست مسلمانوں کو چھوڑ کر پوری کی پوری قوم مسلم لیگ کے جھنڈے تلے قائداعظم محمد علی جناح رح کی زیرِ قیادت اپنے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ میں والہانہ سرگرمِ عمل تھی۔ مودودی صاحب کی حیثیت صرف ایک ماہنامہ کے مدیر کی تھی ——— وہ ماہنامہ جس کی اشاعت حیدرآباد میں تین سو سے زیادہ نہیں تھی۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہاں مودودی صاحب کو کون پوچھتا! لہٰذا جس چیز کو انہوں نے 'سیاسی کشمکش' سے تعبیر کیا تھا وہ درحقیقت ان کی اپنی اندرونی نفسیاتی کشمکش کا آئینہ تھی۔ اُن کی فطرت یہ کہ ——— بعد از خدا بزرگ توئی ——— اور پوزیشن یہ کہ پوری قوم ایک اور شخص کو اپنا قائد تسلیم کئے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حقیقتِ حال سے اُن کے دل میں حسد، حقارت، نفرت کی آگ کے شعلے بھڑکتے تھے۔ یہی وہ شعلے تھے جنہوں نے اُن مقالات کی صورت اختیار کی اور جن کا اجمالی ذکر ہم آئندہ سطور میں کر رہے ہیں:

ہم نے اوپر کہا ہے، اس زمانے میں مسلم لیگ ایک مؤثر اور طاقتور جماعت کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ اور مودودی صاحب یہاں بالکل "یوسفِ بے کارواں" تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں کوئی دوسری پارٹی بنانا اُن کے لئے ممکن نہیں۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کو مسلم لیگ سے برگشتہ کرنے کی تدبیر سوچی۔

اس سلسلے میں انہوں نے سب سے پہلے یہ کہا کہ اسلام میں سرے سے پارٹی بنانا ہی جائز نہیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے فروری ۱۹۳۸ء کے رسالہ "پیغام حق" میں ایک مقالہ لکھا جس میں انہوں نے کہا کہ

پارٹی بنانا خلاف اسلام ہے

یہ قوم تو پہلے ہی ایک جمعیت ہے۔ اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت، الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے، اُن کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا، دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں ہے بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔ یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔ لوگوں نے آنکھیں بند کر کے جمعیت سازی کے یہ طریقے اہل مغرب سے لئے ہیں، مگر ان کو معلوم نہیں کہ جو چیزیں دوسروں کے مزاج کو موافق آئی ہیں، وہ مسلمانوں کے مزاج کو موافق نہیں آسکتیں۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں خاکساروں کی تنظیم بھی ایک بڑی مؤثر جمعیت کی حیثیت رکھتی تھی۔ مودودی صاحب کے مقالہ میں "وردی" یا "کسی ظاہری علامت" سے خاکساروں کیطرف اشارہ تھا۔ علامہ مشرقی (مرحوم) کو آپ جانتے ہیں۔ وہ تو بخشنے والے نہیں تھے۔ انہوں نے اس پر مودودی صاحب کو ایک ڈانٹ پلائی جس کا عنوان تھا۔

"پٹھانکوٹ میں مذہبی بدمعاشی کا نیا اڈہ"

پوری قوم کیخلاف

اس کے بعد مودودی صاحب نے اُدھر کا رُخ تو کیا نہیں، لیکن مسلم لیگ کی تنقید کو انہوں نے اپنا مستقل شعار قرار دے دیا۔ مسلم لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ مسلمان من حیث القوم اُس کے ساتھ ہیں۔ مودودی صاحب نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ جنہیں تم مسلمان کہتے ہو، وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں۔

> یہاں جس قوم کا نام مسلمان ہے وہ ہر قسم کے رطب و یابس لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کیریکٹر کے اعتبار سے جتنے ٹائپ کافروں میں پائے جاتے ہیں اُتنے ہی اس قوم میں بھی موجود ہیں .... یہ اخلاقی حالت جس قوم کی ہو، اُس کی تمام کالی اور سفید بھیڑوں کو جمع کر کے ایک منظم گلہ بنا دینا اور سیاسی تربیت سے اُن کو لومڑی کی ہوشیاری سکھانا یا فوجی تربیت سے اُن میں بھیڑیئے کی درندگی پیدا کرنا، جنگل کی فرمانروائی حاصل کرنے کے لئے تو ضرور مفید ہو سکتا ہے مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس سے اعلائے کلمۃ اللہ کس طرح ہو سکتا ہے۔
>
> (ترجمان القرآن۔ محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۵۸)

دوسرے مقام پر انہوں نے لکھا :-

ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ اُن کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول پر ہی ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہِ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے، اُس کا حال یہ ہے کہ اُس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں، نہ حق اور باطل کی تمیز سے آشنا ہیں۔ نہ اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آ رہا ہے۔ اس لئے یہ مسلمان، نہ انہوں نے حق کو حق جان کر قبول کیا ہے، نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ اس کی کثرتِ رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی، تو اُس کی خوش فہمی قابلِ داد ہے۔

(ترجمان القرآن - محرم ۱۳۶۰ھ - صفحہ ۲۴)

اُس زمانے میں ایک تو مودودی صاحب کی حیثیت ایک جرنلسٹ سے زیادہ کچھ نہیں تھی اور دوسرے مسلم لیگ کی قیادت اُس وسیع النظر، کشادہ قلب، بلند کردار انسان کے ہاتھوں میں تھی جو احساسِ کمتری کا شکار نہیں تھا۔ اس لئے نہ قوم نے ان خرافات کو درخورِ اعتنا سمجھا اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ نے ہی ان ہفوات کا کوئی نوٹس لیا۔ لیکن مودودی صاحب اُن کی اس کشادہ نگہی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے چلے گئے اور مسلم لیگ کا ساتھ دینے والے مسلمانوں کی تنقیص اور تکفیر میں مسلسل آگے بڑھتے گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازاریت پر بھی اُتر آئے۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں یہاں تک لکھ دیا کہ

غرض آپ اس نام نہاد مسلم سوسائٹی کا جائزہ لیں گے تو اس میں آپ کو بھانت بھانت کا مسلمان نظر آئے گا۔ مسلمان کی اتنی قسمیں ملیں گی کہ آپ شمار نہ کر سکیں گے۔ یہ ایک چڑیا گھر ہے جس میں چیل، کوّے، گدھ، بٹیر، تیتر اور ہزاروں قسم کے جانور جمع ہیں اور ان میں سے ہر ایک "چڑیا" ہے کیونکہ چڑیا گھر میں داخل ہے۔

رفتہ رفتہ وہ آگے بڑھے اور مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتوں کو بھی ساتھ ہی رگیدنا شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ میں لکھا کہ

لہ انہوں نے ہزار میں سے (۹۹۹) کہہ کر ایک کی استثناء کیوں کی ہے؟ اس کی وجہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گی!

اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں، اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر اُن کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنسِ فاسد نکلیں گی۔

مسلم لیگ کا دعویٰ تھا کہ وہ جداگانہ مملکت کا مطالبہ اس لئے کر رہی ہے کہ وہ وہاں اسلامی حکومت قائم کرسکے۔ اس سلسلے میں مودودی صاحب نے فرمایا کہ

پاکستان میں مسلمانوں کی کافرانہ حکومت اسلامی نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کی کافرانہ حکومت کے مقابلہ میں کچھ بھی قابلِ ترجیح نہیں ہوگی، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔

(ترجمان القرآن۔ بابت محرم ۱۳۶۰ھ حاشیہ صفحہ ۲۷)

خود قائدِ اعظم کے خلاف

جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، اس وقت مسلم لیگ کی قیادت ایک ایسے ٹھنڈے دل و دماغ کے انسان کے ہاتھ میں تھی جسے اس قسم کی باتیں برانگیختہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے قائدِ اعظم نے مودودی صاحب کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا لیکن مودودی صاحب اور آگے بڑھتے گئے اور ۔۔۔ بازی بازی باریش ہم بابا بازی کے مصداق عام مسلمانوں سے آگے بڑھ کر ۔۔۔ خود مسلم لیگ کے قائدین کو بھی اپنی تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنانے لگ گئے۔ چنانچہ انہوں نے سیاسی کشمکش (حصہ سوم) کے شروع میں مسلم لیگ کی قیادت کے متعلق لکھا۔

اس نئی تحریک کے دور میں عامۂ مسلمین کی قیادت و رہنمائی ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں چلی گئی جو دین کے علم سے بے بہرہ ہے اور محض قوم پرستانہ جذبے کے ماتحت اپنی قوم کے دنیوی مفاد کے لئے کام کر رہا ہے۔ دین کا علم رکھنے والا عنصر اس گروہ میں اتنا بھی نہیں، جتنا آٹے میں نمک ہوتا ہے۔

خود قائدِ اعظمؒ کے متعلق لکھا۔

افسوس کہ لیگ کے قائدِ اعظمؒ سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرزِ فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نظر سے پرکھتا ہو۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ۔ صفحہ ۳۱۲)

اس سے ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں کہ سیاسی قیادت اُن لوگوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے

جن کے خیالات، نظریات، طرزِ سیاست اور رنگِ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی۔ ان کا یہ حال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے

> لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین و دساتیر ہی میں ملتا ہے۔

واضح رہے کہ اُس زمانے میں مسلم لیگ کے قائدین کے گروہ میں علامہ اقبالؒ جیسی ہستیاں بھی شامل تھیں۔ لیکن مودودی صاحب تو آسمان کی بلندیوں پر متمکن تھے، انہیں "خاک کے یہ ذرّے" کس طرح نظر آتے۔

کہا جائے گا کہ مودودی صاحب نے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ کہا تھا، اُس میں کون سی بات غلط تھی۔ کیا ہماری اخلاقی حالت ایسی ہی نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہماری اخلاقی حالت ایسی ہی تھی اور ایسی ہی ہے لیکن مودودی صاحب اس قوم پر اس طرح تنقید کرتے تھے گویا وہ ان میں سے نہیں۔ یہ قوم تو ان بداخلاقیوں میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن مودودی صاحب کہیں آسمان سے اُترے ہیں اور بالکل معصوم اور منزہ عن الخطا ہیں۔ یاد رہے کہ اس بات کا حق خدا کے ایک رسول کو تو پہنچتا ہے کہ وہ آکر اپنی پوری کی پوری قوم سے کہے کہ تم فسق و فجور، اور کفر و عصیان کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہو اور میں حق و صداقت کا علمبردار بن کر آیا ہوں۔ آؤ اور اس روشنی میں میرے پیچھے پیچھے چلو۔ لیکن یہ حق کسی اور کو نہیں پہنچتا کہ وہ قوم پر اس قسم کی تنقید کرے اور اپنے آپ کو اس سے بالا سمجھے۔ مودودی صاحب جب عامۃ المسلمین اور ان کی قیادت پر تنقید کرتے تھے تو وہ درحقیقت کہتے یہ تھے کہ تم سب کافرانہ زندگی بسر کرتے ہو مومن بننا چاہتے ہو تو میری طرف آؤ۔ چنانچہ ان کی اس تنقید کا یہ نتیجہ نکلا کہ کچھ لوگ سچ مچ یہ سمجھنے لگے کہ ہم مسلم کافرنہاد ہیں۔ صحیح مسلمان بننے کے لئے ہمیں اسی شخص کی دعوت پر لبیک کہنا چاہیئے۔ جب ان لوگوں نے اس کی آمادگی ظاہر کی تو مودودی صاحب نے (جنہوں نے شروع میں یہ کہا تھا کہ مسلمانوں میں کوئی الگ جماعت قائم کرنا خلافِ اسلام ہے) اپنی جداگانہ جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام 'جماعتِ اسلامی' رکھا۔ اس جماعت میں شمولیت کے متعلق فرمایا کہ

اپنی الگ جماعت

> جماعتِ اسلامی میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو۔ اور وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اُس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور یہ شہادت، اس کے طرزِ خیال اور طرزِ زندگی میں کس قسم

> کے تغیر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد الرسول اللہ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعتِ اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے۔ خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتدائے شہادت ادا کرے۔ یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔ (ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۱ھ صفحہ ۸۴)

ان شرائط کی وضاحت کے بعد جماعتِ اسلامی کے یومِ تاسیس کی جو روئیداد شائع ہوئی تھی اُس میں بتایا گیا تھا کہ اس میں شامل ہونے والوں نے کس طرح تجدیدِ ایمان کی اور مودودی صاحب کو اپنا امیر تسلیم کیا — یہ تھی "ہزار میں سے ایک فرد" کا مجموعہ جماعت!

برخود غلط گروہ

یوں نفرت اور رعونت کے شجرۃ الزقوم کا یہ بیج ۱۹۴۱ء میں بویا گیا۔ آپ سوچیے کہ جس گروہ کے دل میں یہ بٹھا دیا گیا ہو کہ یہ تمام مسلمان فاسق اور فاجر بلکہ کافر اور بے دین ہیں اور ان میں سے تم ہی پکے اور سچے مومن ہو، ان کے دل میں ان مسلمانوں کے خلاف جذباتِ نفرت کس شدت سے موجزن ہونگے اور دوسری طرف ان میں کتنی شدید رعونت اور خود پسندی پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ اُس کے بعد عامۃ المسلمین اور خود ساختہ "مقدسین" کے اس گروہ میں ایک گہری حدِ فاصل حائل ہو گئی۔ یہ گروہ باقی مسلمانوں کو نہایت ذلت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اُن کے قائدین کا مذاق اڑاتا تھا اور اپنے امیر کو یکتا اور منفرد سمجھتا تھا۔ چنانچہ اُسی زمانے میں انہوں نے مودودی صاحب کے متعلق یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ شخص اپنے آپ کو دس کروڑ مسلمانوں میں تنہا پاتا ہے۔

ان کی جماعت کے دل میں یہ خیال ابھرتا تھا کہ ہماری تعداد بڑی قلیل ہے، ہم اکثریت کے مقابلے میں کیا کر سکیں گے۔ تو انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا گیا کہ

> جو جماعتیں کسی طاقتور نظریہ اور جاندار اجتماعی فلسفہ کو لے کر اٹھیں گی وہ ہمیشہ قلیل التعداد ہی ہوتی ہیں اور قلتِ تعداد کے باوجود بڑی بڑی اکثریتوں پر حکومت کرتی ہیں۔ روسی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی تعداد اس وقت صرف بتیس لاکھ ہے۔ اور انقلاب کے وقت اس سے بہت کم تھی مگر اُس نے ۱۷ کروڑ انسانوں کو مسخر کر لیا۔ مسولینی کی فاشسٹ پارٹی صرف چار لاکھ ارکان پر مشتمل ہے اور روم پر مارچ کرتے وقت تین لاکھ تھی مگر یہ قلیل تعداد ساڑھے چار کروڑ اطالوی باشندوں پر چھا گئی۔ یہی حال جرمنی کی نازی پارٹی کا ہے .... اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قلت آج بھی حکمران بن سکتی ہے بشرطیکہ وہ اُسی طرح مجاہدہ کرے جس طرح ایک اصول اور ایک مسلک

رکھنے والی جماعت کیا کرتی ہے ۔ (ترجمان القرآن ذی الحجہ ۱۳۵۹ھ صفحہ ۴۸)

انہیں یہ تعلیم دی گئی کہ

اٹھو۔ اور حکومت پر قبضہ کر لو

اسلام کی نگاہ میں یہ بات ہرگز کافی نہیں ہے کہ تم نے خدا کو خدا اور اس کے قانون کو قانونِ برحق مان لیا ہے نہیں، اس کو ماننے کے ساتھ ہی آپ سے آپ تم پر یہ فرض عاید ہو جاتا ہے کہ جہاں بھی تم ہو جس سرزمین میں تمہاری سکونت ہو، وہاں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو۔ حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شر پسند عناصر کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگانِ خدا کی سربراہ کاری اپنے ہاتھ میں لے کر خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری اور جواب دہی کا اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات انجام دو۔ اسی کوشش اور اسی جدوجہد کا نام جہاد ہے۔ (خطبات۔ صفحہ ۲۳۴)

پھر اُن سے کہا گیا کہ خدا نے جماعتِ مومنین کے متعلق بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ

تم روئے زمین پر خدا کے سب سے زیادہ صالح بندے ہو۔ لہٰذا آگے بڑھو۔ لڑ کر خدا کے باغیوں کو حکومت سے بے دخل کر دو اور حکمرانی کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لو۔

(خطبات۔ صفحہ ۲۳۵)

یہ تھا وہ آبِ گل جس سے اس جماعت کا خمیر اٹھایا گیا اور ان کی سرشت کی تشکیل کی گئی تھی۔ یعنی یہ بات ان کے دل میں راسخ کر دی گئی کہ

(۱) یہ پیدائشی مسلمان سب جہنم کے کندے ہیں۔ سچے اور سچے مسلمان تم ہی ہو۔ تم خدا کے صالح بندے ہو۔ تم حزب اللہ ہو۔

(۲) تم اپنی قلتِ تعداد پر نہ جاؤ۔ روس کے کمیونسٹوں، اٹلی کے فاشسٹوں اور جرمنی کے نازیوں سے سبق سیکھو۔ جنہوں نے قلیل التعداد ہوتے ہوئے اکثریت پر غلبہ حاصل کیا اور انہیں اپنے استبداد کے آہنی شکنجوں میں جکڑا۔

(۳) حکومت قائم کرنا صرف تمہارا حق ہے۔ یہ دوسرے مسلمان جو حکومت قائم کریں گے وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔ خدا کی حکومت کرنے کے حق دار بلکہ اجارہ دار تم ہی ہو۔ اطاعتِ امیر سے اپنے اندر قوت پیدا کرو۔ اور اقتدار کی کنجیاں ان فاسقوں اور فاجروں کے ہاتھوں سے چھین لو۔ یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔

سوچئے کہ جس جماعت کو یہ سبق پڑھایا جائے وہ جماعت نفرت، حقارت اور عداوت کے بیج نہیں بوئے گی تو اور کیا کرے گی۔ تحریک پاکستان کے دوران یہ سلسلہ اس نفرت کو عام کرتے چلے گئے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ مسلمانوں کی جمعیت قائداعظمؒ کے زیر قیادت اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ اس جماعت کی یہ کارفرمائیاں اُن میں کسی رخنہ اندازی کا موجب نہ بن سکیں۔ نہ ہی انہوں نے انہیں اس قابل سمجھا کہ ان سے کوئی ٹکر لی جائے۔ یونہی اکا دکا واقعات ایسے رونما ہوئے جس میں مسلم لیگ کے بعض کارکنوں کے ساتھ ان کا ٹکراؤ ہوا اور وہ بھی مدراس، اور پٹنہ جیسے دور دراز علاقوں میں۔

ہندوؤں سے ساز باز

جب انہوں نے یہ دیکھا کہ ان کی تنہا کوششیں مسلم لیگ کی صفوں میں کوئی انتشار پیدا نہیں کر سکیں تو انہوں نے ہندوؤں سے بھی ساز باز شروع کی۔ چنانچہ انہوں نے پٹنہ میں اپنے پہلے پبلک جلسہ میں مسٹر گاندھی کو دعوت دی اور انہوں نے اس میں شرکت بھی کی لیکن ہمارا خیال ہے کہ (گاندھی جی نے اس .... کو کچھ منفعت بخش نہ سمجھا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ تشکیل پاکستان سے تین چار ماہ پہلے کا واقعہ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو نوائے وقت مؤرخہ ۳۰ر اپریل ۱۹۴۷ء)۔

یوں عامۃ المسلمین کو کوستی، اور اُن کی قیادت کو گالیاں دیتی ہوئی یہ جماعت وارد فرمائے پاکستان ہوئی۔

---(•)---

پاکستان پہنچکر

مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے تحریک پاکستان کے خلاف جو کچھ کیا تھا اور وہ جس طرح مسلسل دس برس تک مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کے خلاف نفرت کے جذبات اُبھارتے چلے آئے تھے، ذرا سوچئے کہ اگر معاملہ یوں ہوتا کہ یہی کچھ کسی پارٹی نے جماعت اسلامی کے ساتھ کیا ہوتا اور مودودی صاحب پاکستان کے گورنر جنرل ہوتے تو کیا وہ ان لوگوں کو پاکستان میں گھسنے کی اجازت دیتے۔ اور اگر وہ زبردستی اندر آجاتے تو یہ اُن کے خلاف کیا کچھ نہ کرتے۔ لیکن یہاں صاحب اقتدار قائداعظمؒ جیسا وسیع الظرف سربراہ تھا۔ انہوں نے نہایت کشادہ نگہی اور خندہ جبینی سے کہا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ جو کچھ پہلے ہو چکا وہ ہو چکا۔ اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اب آئندہ کے لئے امن اور سکون سے زندگی بسر کیجئے۔ کوئی اور ہوتا تو وہ قائداعظمؒ کے اس حسن سلوک پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کا رہین منت رہتا لیکن ان حضرات کے دل میں تو حسد کی آگ بھڑک رہی تھی کہ قائداعظمؒ کی قیادت کامیاب کیوں ہو گئی۔ اور ہماری اس مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آگیا۔ چنانچہ انہوں نے ترجمان القرآن کے پہلے ہی شمارہ میں (جو جون ۱۹۴۸ء کو شائع ہوا تھا) تحریک پاکستان پر بھرپور تنقید کی۔ اور اُس کے بعد دل کے پھپھولے یہ کہہ کر پھوڑے کہ

> یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلے ربع صدی میں ہماری سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے۔

پھر اُس کے بعد انہوں نے اگست ۱۹۵۰ء کے ترجمان القرآن میں لکھا ۔

> اس پورے گروہ میں سے ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گروں سے بھری پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشہ دکھایا اور اس قوم کی رہی سہی عزت بھی خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے بنے ہوئے تھے ۔

آپ سوچئے کہ اس زمانے میں حالات کیا تھے ۔ تقسیم ہند کے عواقب کے سلسلے میں مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی تھی، اُس سے ہر ایک کے سینے آبلہ ہو رہے تھے ۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہیاں ہندو کے جذبۂ عناد اور انگریز کے جذبۂ شکست خوردگی کی وجہ سے لائی گئی تھیں لیکن اُس وقت قوم سے یہ کہنا کہ ان تباہیوں کے ذمہ دار تمہاری قیادت ہے جس کے متعلق ہم دس برس سے متنبہ کرتے چلے آرہے تھے، قوم کے دل میں کس قسم کی کیفیات اکیاسے کا موجب بن سکتا تھا ۔ قوم اپنی مصیبت میں مبتلا تھی ۔ اس لئے وہ یہ سب کچھ سن کر پی گئی لیکن اُس کے تحت الشعور میں اس جماعت کے خلاف جذباتِ نفرت نیم خوابیدہ حالت میں کروٹیں لیتے رہے ۔ اُس کے بعد آج تک پاکستان میں کوئی ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی جس کے خلاف انہوں نے جذباتِ نفرت اور حقارت مشتعل نہ کئے ہوں ۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد پہلی حکومت کے متعلق انہوں نے لکھا تھا ۔

> کسی ملک و قوم کی انتہائی بدقسمتی یہ ہو سکتی ہے کہ نااہل اور اخلاق باختہ قیادت اُس کے اقتدار پر قابض ہو جائے ۔ ایک سفینۂ حیات کو غرق کرنے کے لئے طوفان کی موجیں وہ کام نہیں کر سکتیں جو اس کے خیانت کار ملاح کر سکتے ہیں کسی قلعہ کی دیواروں کو دشمن کے گولے اس آسانی سے نہیں چھید سکتے جس آسانی سے اس کے فرض ناشناس سنتری اُس کی تباہی کا سامان کر سکتے ہیں ۔ (ترجمان القرآن ۔ جون جولائی ۱۹۴۹ء)

اور اس ساری تنقید کا ٹیپ کا بند یہ تھا کہ

> ایسے حالات میں غیر صالح قیادت کو ایک منٹ کے لئے بھی گوارا کرنا خلافِ مصلحت ہے ۔ ایک غلط قیادت کی بقا کے لئے اس طرح کی کوشش کرنا ملک اور قوم کے ساتھ سب سے بڑی غداری اور غلط قیادت سے نجات دلانے کی فکر کرنا ۔ اس کی سب سے بڑی خیر خواہی ہے ۔
>
> (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ہوسِ اقتدار کی جو چنگاری پہلے دن سے ان کے سینہ میں تڑپ رہی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کس طرح شعلوں میں تبدیل ہو گئی ہے اور اس کے لئے ٹیکنیک وہی استعمال کی جا رہی ہے کہ ہمارے سوا قیادت کسی کے ہاتھ میں بھی

ہو، وہ غیر صالح قیادت ہوگی۔ اور صالح قیادت صرف صالحین کی قیادت ہی قرار پائے گی۔ چنانچہ انہوں نے اپنی جماعت کے منشور میں اپنی جماعت کا نصب العین ان الفاظ میں بیان کیا کہ

پاکستان کی سیاسی قیادت کو ایک صالح قیادت میں بدل دیا جائے۔

صالحین کا گروہ

تقسیم سے پہلے ان صالحین کا دائرہ محدود تھا، اب انہوں نے اسے وسیع کیا۔ چنانچہ مودودی صاحب نے جولائی ۱۹۵۵ء میں سرگودہا میں ایک تقریر کے دوران فرمایا۔

اس وقت جماعت اسلامی نے دو بڑے کام کئے ہیں، پہلا کام جماعت نے یہ کیا ہے کہ اس نے اس ملک میں قابل اعتماد کیریکٹر رکھنے والے لوگوں کو منظم کیا ہے اور یہ وہ چیز ہے جس کی اس وقت ہمارے ملک کو بڑی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صورت حال یہ ہے کہ ملک کی سیاسی جماعتوں، سرکاری ملازمین، تاجر اور صنعت پیشہ طبقہ غرض ہر گروہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کے کیریکٹر اور کردار پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ قومی امانت کا کوئی کام ان کے سپرد کر کے انسان مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کوئی قول و قرار اس خطرے کے بغیر نہیں کیا جا سکتا، کہ قول و قرار کرنے والے صاحب اپنے قول سے پھر نہ جائیں۔ اس کیفیت میں قوم کی عظیم اکثریت مبتلا ہے۔ جماعت اسلامی کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ دیکھے کہ اس سیرت و کردار والی قوم میں کہاں کہاں قابل اعتماد سیرت والے لوگ موجود ہیں۔ آج بھی ہماری کوشش یہی ہے کہ ایسے مضبوط کیریکٹر والے لوگوں کو منظم کیا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ کچھ قابل اعتماد لوگ بھی اس ملک میں موجود ہیں۔

(بحوالہ اعتصام - ۱۵ جولائی ۱۹۵۵ء)

اس طرح اس پوری قوم سے "بلند سیرت و کردار" کے افراد کو اکٹھا کر کے صالحین کے گروہ کو وسیع کیا گیا۔ آپ سوچئے کہ جس فرد کو بھی اس گروہ میں شامل کر لیا جائے وہ اپنے آپ کو کس طرح ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرے گا اور باقی قوم کو کس طرح ذلت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھے گا۔

جس نے ذرا اختلاف کیا ....

اور آپ کو معلوم ہے کہ صالحین کے اس گروہ میں شامل ہونے کی شرط کیا ہے۔ صرف یہ کہ وہ مودودی صاحب کی ہاں میں ہاں ملائے۔ جو شخص ان کا ہمنوا ہو جائے وہ کوئی (معاف کیجئے) "بازاری شہدہ" بھی کیوں نہ ہو، صالح ترین بزرگ قرار پا جاتا ہے اور ان صالحین کے گروہ میں سے جو شخص کسی معاملے میں مودودی صاحب سے اختلاف کرے وہ بدترین خلائق قرار دیا جاتا ہے اور اس پر وہ گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے کہ توبہ بھلی۔ مثال کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی

کو لیجئے۔ جماعت میں ان کا مقام مودودی صاحب کے دوسرے درجے پر تھا۔ وہ کئی مرتبہ جماعت کے امیر بھی رہے۔

ماہر القادری صاحب نے ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا۔

> عالم، بلند نظر اور متبحر عالم جس کی نگاہ خاک کے ذروں کا بھی جائزہ لیتی ہے اور سدرۃ المنتہیٰ کی گزرگاہوں کا بھی پتہ کرتی ہے۔ دس بیس نہیں، ہزاروں راتیں صرف قرآنِ کریم کے مطالعہ میں بسر کی ہیں۔ جن کی ذات قرآنی علوم کے لئے قابلِ وثوق سند ہے۔ قرآن کا مفسر، اور حدیث و فقہ میں جس کی ژرف نگاہی مسلّم۔ (فاران۔ بابت جون ۱۹۵۳ء)

لیکن، انہی اصلاحی صاحب کو جب مودودی صاحب سے کچھ اختلاف ہوا، اور وہ جماعت سے الگ ہو گئے تو خود مودودی صاحب اور ان کے مصاحبوں نے اصلاحی صاحب کے خلاف وہ کچھ کہا جس کی شہادت اُن کے جرائد و رسائل آج تک دیتے ہیں۔ "وہ کجروی کے مرتکب، ضعفِ ارادہ و نفرت کے مریض، ایک زخمی تحریکِ اسلامی کے نادان دوست، جماعت کے غدار، اقامتِ دین کی جدوجہد کے روڑے، خدا کے خوف سے عاری، خائن، انتشار پسند۔" (المنبر۔ بابت ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء)

صالح اور غیر صالح کا معیار

مودودی صاحب کے نزدیک صالح اور غیر صالح کا معیارِ امتیاز کیا ہے، اسکا اندازہ اس سے لگایئے کہ انہوں نے ۱۹۶۲ء کے آئین کے تحت انتخابات کے سلسلے میں یہ کہا تھا کہ

> اگر کنونشن مسلم لیگ کسی فرشتے کو بھی امیدوار کھڑا کرے تو جماعت اس کی حمایت نہیں کریگی کیونکہ ہمیں اس کے اصولوں سے اتفاق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے، اُسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اُس نے یہ اصول تسلیم کر لیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریئے کے مطابق ہونا چاہیئے۔
>
> (بحوالہ امروز۔ ۲ اگست ۱۹۶۳ء)

یعنی ان کا ہمنوا کافر، مخالف پارٹی کے فرشتے سے بھی بہتر ہے۔

سوچئے کہ نفرت انگیزی کے لئے اس سے بڑھ کر کچھ اور بھی کہا اور کیا جا سکتا ہے۔ اور مصیبت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا جاتا ہے۔ یعنی جس طرح مومن اور صالح وہ ہے جو ان کا ہمنوا ہو، اسی طرح اسلام بھی وہی اسلام ہے جس کی تائید مزاج شناسِ رسولؐ یعنی مودودی صاحب فرما دیں۔ ان کے کسی فیصلے اور کسی نظریہ کے خلاف کوئی اور نظریہ، ان کے نزدیک یکسر غیر اسلامی اور زندقہ، الحاد، اور کفر ہے۔ اصلاحی صاحب نے جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہوتے وقت مودودی صاحب سے یہی کہا تھا کہ

> آپ اپنے آپ کو نہ صرف جماعتِ اسلامی کا قائم مقام سمجھتے ہیں بلکہ خود اسلام کا بھی

قائم مقام سمجھنے لگے ہیں۔ آپکے نزدیک اگر آپ کی کسی حرکت پر کسی کو اعتراض ہو تو وہ جماعت پر اعتراض ہے۔ اور جب یہ جماعت پر اعتراض ہے تو اسلام پر اعتراض ہے۔ اسی طرح آپ اپنا یہ ذہن بنا بیٹھے ہیں کہ آپ کی ذات اگر کبھی زیر بحث آتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس ملک میں اقامت دین کا سارا کام درہم برہم ہو جائے گا اور لادینی طاقتیں غالب ہو جائیں گی۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ سوچنے کے اس انداز کو بدلیں، خدا نے اسلام کو نہ آپکے ساتھ باندھا ہے نہ جماعت اسلامی کے ساتھ اور نہ کسی اور کے ساتھ۔ اگر آپ اسلام کا کام کرنے اٹھے ہیں تو خدارا اس کی یہ قیمت نہ مانگیئے کہ اگر آپ اسلام پر بھی ہاتھ صاف کرنے لگ جائیں تو بھی لوگ اس کو جاننے کے باوجود چپ رہیں، کیونکہ اس سے اقامت دین کے جہاد کو نقصان پہنچ جائے گا۔

(اصلاحی صاحب کا خط مودودی صاحب کے نام)

مُرغِ بادنما کا سا اِسلام

یہ ہے وہ آہنی ڈکٹیٹرشپ جسے اقامت دین اور اسلامی نظام کے نام پر اس سختی سے مسلط کیا گیا ہے کہ مودودی صاحب جو کچھ کہہ دیں، ان کی جماعت آمنا و صدقنا کہنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اُن کا اسلام "حکمتِ عملی" کے مسلک کے تابع آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً:-

(۱) الگ پارٹی بنانا اسلام کی رُو سے ناجائز ہے لیکن اُس کے بعد اپنی الگ پارٹی بنانا عین تقاضائے اسلام قرار پاجاتا ہے۔

(۲) جمہوریت کی رُو سے قائم کردہ حکومت، کافرانہ حکومت سے بھی بدتر ہے اور پھر جمہوریت عین مطابقِ اسلام ہے۔

(۳) صدرِ مملکت کے لئے ویٹو کا استعمال، اسلامی نظام کا تقاضا ہے اور اُس کے بعد صدارتی نظام اس لئے خلافِ اسلام ہے کہ اس میں صدر کو ویٹو کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔

(۴) انتخابات میں امیدوار کھڑے کرنا یکسر خلافِ اسلام ہے اور پھر ایک ایک سیٹ کے لئے اپنے امیدوار کھڑے کرنا عین تقاضائے اسلام۔

(۵) عورت کا سیاست میں حصہ لینا یکسر خلافِ اسلام ہے اور پھر عورت کا صدارت تک کے لئے بطور امیدوار کھڑے ہونا، عین مطابقِ اسلام۔

(۶) زمین کی جائیداد وغیرہ کی ملکیت پر کسی قسم کی تحدید خلافِ اسلام ہے اور پھر اراضی کے رقبے کی حد بندی

عین مطابقِ اسلام۔

(۵) "نیشنلائزیشن (قومیانہ) کے انسانیت کش نظام سے بدتر نظام ابلیس آج تک ایجاد نہیں کر سکا" یہ بھی اسلام۔ اور اس کے بعد کلیدی منصبوں کو قومی ملکیت میں لے لینے کا فیصلہ، یہ بھی اسلام۔

جو شخص ان کے اس مرغِ بادنما اسلام پر صاد کرتا چلا جائے، اس کا شمار صالحین میں اور جو اس سے اختلاف کرے وہ جہنم کا کندہ جس سلک پر یہ کامزن ہوں وہ اسلامی نظام کا صحیح نقشہ اور دوسری پارٹیاں جو نظریہ پیش کریں، وہ غیر اسلامی۔

آپ سوچئے کہ جس جماعت کے امیر کی نفسیاتی کیفیت یہ ہو کہ وہ اسلاف سے لیکر اخلاف تک کسی کو اپنا ہم پایہ نہ سمجھے اور اپنے ہر قول کو دین میں سند اور حجت قرار دے؛

جس کے ارکان اور متفقین کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا جائے کہ وہ دنیا میں اسلام کے صحیح نمونہ اور خدا کے منتخب، صالح افراد ہیں اور جو لوگ اُن کے ہمنوا نہیں، وہ سب فاسقانہ اور کافرانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔!

جن کا اسلام ہر مصلحت کے ساتھ آئے دن بدلتا رہے،

اور جس جماعت کے پاس روپیہ سیلاب کی طرح بہے چلا آئے،

اُس جماعت کے صاحبِ اثر اور صاحبِ اقتدار ہو جانے کا اندیشہ باقی قوم کے دل میں کیا کیا خطرات پیدا نہیں کر دیتا؟ اس وقت ملک میں نفرت، حقارت، عداوت، وحشت اور دہشت کی جو فضا عام ہو رہی ہے اُس کی بنیادی علت یہ ہے۔ اس جماعت نے گذشتہ تیس سال سے نفرت اور حقارت کی جو فضا پیدا کرنا شروع کی تھی، وہ اب اپنی انتہا تک پہنچ گئی ہے اور جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، اُس کے ردِ عمل میں ہر طرف سے نفرت اور حقارت کے جذبات مشتعل ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس جماعت کے عزائم کیا ہیں، وہ بھی سن لیجئے۔ مودودی صاحب اپنی کتاب "مرتد کی سزا" میں اس سوال کے جواب میں کہ مستقبل میں مسلمانوں کیساتھ کیا کیا جائے گا، لکھتے ہیں کہ

سب کو قتل کر دیا جائے گا

میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ واللہ الموفق بالصواب۔ کہ جس علاقے میں اسلامی نظام رونما ہو، وہاں کی مسلمان آبادی کو نوٹس دے دیا جائے کہ جو لوگ اسلام سے اعتقاداً و عملاً منحرف ہو چکے ہیں، اور منحرف ہی رہنا چاہتے ہیں، وہ تاریخِ اعلان سے ایک سال کے اندر اندر اپنے غیر مسلم ہونے کا باقاعدہ اظہار کر کے ہمارے نظامِ اجتماعی سے باہر نکل جائیں۔ اس مدت کے بعد اُن سب لوگوں کو جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں، مسلمان سمجھا جائے گا، تمام قوانین اسلامی اُن

پر نافذ کئے جائینگے۔ فرائض و واجباتِ دینی کے التزام پر انہیں مجبور کیا جائے گا۔ پھر جو کوئی دائرہ اسلام سے باہر قدم رکھیگا (یعنی جس بات کو مودودی صاحب اسلام کہدینگے، اسکے دائرے سے باہر قدم رکھیگا۔ طلوع اسلام) اُسے قتل کر دیا جائیگا۔ اس اعلان کے بعد انتہائی کوشش کی جائیگی کہ جس قدر مسلمان زادوں اور مسلمان زادیوں کو کفر کی گود میں جانے سے بچایا جا سکتا ہے بچا لیا جائے، پھر جو کسی طرح نہ بچائے جا سکیں انہیں دل پر پتھر رکھ کر ہمیشہ کے لئے اپنی سوسائٹی سے کاٹ پھینکا جائے اور اس عمل تطہیر کے بعد اسلامی سوسائٹی کی نئی زندگی کا آغاز صرف ایسے مسلمانوں سے کیا جائے جو اسلام پر راضی ہوں۔ (یعنی ان سے متفق ہوں۔ طلوع اسلام)۔

(صفحہ ۸۱ - ۸۰)

یہ ہے وہ آنے والے دور کا انتہائی خوفناک بھوت (فرینکن سٹائن) جس کے تصور سے پاکستان کا ہر امن پسند شہری لرزاں و ترساں ہے۔ ان میں سے بعض نے یہ روش اختیار کر لی ہے کہ منافقانہ طور پر ہی سہی، اس جماعت کی ہاں میں ہاں ملاتے رہو۔ بعض (INDIFFERENT) رہنے میں عافیت سمجھتے ہیں ــــ یا یوں کہیئے کہ وقت ٹالتے ہیں ــــ بعض سر پھرے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے تباہ کن مسلک پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے انتشار اور خلفشار کا وہ عالم جس میں اس وقت یہ ملک بدقسمتی سے گرفتار بلا ہے۔ جیسا کہ قارئین کو معلوم ہے۔ طلوع اسلام کی نہ کوئی پارٹی ہے نہ یہ عملی سیاسیات میں حصہ لیتا ہے۔ لیکن اگر یہ دیکھتا ہے کہ اس خطۂ پاک کی طرف ــــ جسے ہم نے اپنی بڑی مقدس آرزوؤں کی تعبیر کے لئے حاصل کیا تھا ــــ کوئی خطرہ بڑھے چلا آ رہا ہے تو یہ قوم کو اس سے متنبہ کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہے۔ طلوع اسلام نے جماعت اسلامی کے اس خطرے کو آج نہیں، اسکے یوم تاسیس کے زمانے ہی سے بھانپ لیا تھا اور اسی وقت سے قوم کو اس سے متنبہ کرنا شروع کر دیا تھا (یہ ۱۹۴۱ء کی بات ہے) تشکیل پاکستان کے بعد بھی وہ مسلسل اور متواتر قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کے نزدیک اس خطرے کے سدباب کا طریق ــــ اینٹ کا جواب پتھر ــــ نہیں، اس سے ملک تباہ ہو جائے گا اور اسکے بدخواہ گھی کے چراغ جلائیں گے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ملک کی دیگر پارٹیاں دہشت سامانی اور نفرت انگیزی کے مسلک سے یکسر اجتناب کر کے اپنی ساری کوششوں کو اس مقصد پر مرتکز کر دیں کہ نہایت پُرامن اور ٹھنڈے طریقے سے دلائل و براہین کی رُو سے قوم کو بتایا اور سمجھایا جائے کہ جماعت اسلامی کی تائید اور حمایت سے اس ملک میں کس قسم کی حالت پیدا ہو جائے گی۔ اگر قوم کو صحیح طریق سے اس خطرہ سے متنبہ کر دیا جائے اور وہ اس جماعت کی سرگرمیوں کی تائید نہ کرے تو آپ دیکھیں گے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد اس جماعت کا اثر خود بخود کم اور رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اکاس بیل کی اپنی جڑ کوئی نہیں ہوتی۔ وہ درخت کا خون چوستی اور اس سے بڑھتی پھولتی ہے۔ اُسے اگر درخت سے الگ کر دیا جائے ــــ یا یوں کہیئے کہ درخت کو اُس سے الگ کر دیا

جاتے۔ تو وہ چند دنوں میں مرجھا کر خود ہی ختم ہو جاتی ہے تقسیم سے پہلے نہ قوم نے ان کا ساتھ دیا، نہ قائداعظمؒ نے ان کا کوئی نوٹس لیا تو یہ کوئی اثر اور اقتدار پیدا نہ کر سکی۔ آپ اسے جس قدر اہمیت دیتے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اس سے متصادم ہوتے جائینگے، اس کا حیطۂ اثر اتنا ہی وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ اس سے ملک میں بدامنی پھیلے گی اور ان طاقتوں کا منشا پورا ہو گا جن کی آنکھوں میں پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ دلائل و براہین سے ان کے خود ساختہ اسلام کی پردہ دری کیجئے۔ اسناد و شہادات سے ان کے عزائم کو بے نقاب کیجئے۔ ان سے پیدا ہونے والے خطرات سے قوم کو آگاہ کیجئے ـــــ لیکن ان سے الجھئے نہیں، ٹکرایئے نہیں، پُرامن رہیئے اور ثبات و استقامت سے اپنے پروگرام پر عمل پیرا رہیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد ساری دنیا کی دولت بھی ان کے پاؤں نہیں جمنے دے گی۔ پیسے کے زور پر نفرت پھیلائی جا سکتی ہے، ہنگامے برپا کئے جا سکتے ہیں، دلوں میں گھر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس جماعت کے اسقدر وسیع وشدید پروپیگنڈہ کے باوجود اس کی جڑیں مضبوط نہیں ہیں۔

روپیہ اور پروپیگنڈہ کے زور پر ہنگامہ آرائیاں برپا کر کے دوسروں کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ یوں یہ تاثر پیدا کر دیا جاتا ہے کہ انہیں بہت بڑا اقتدار حاصل ہے لیکن ایسی روش اور اس قسم کی ذہنیت کے حصے میں بقا نہیں ہوتی۔ وامّا ما ینفع الناس فیمکث فی الارض، خدا کا اٹل قانون ہے۔ یہاں بقا اسی کو نصیب ہو سکتی ہے جو اس پروگرام کو لے کر اُٹھے۔ جو اقدار سماوی کے مطابق عام انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو۔ اس لئے یہاں بھی آخرالامر بقا اسی کے لئے ہوگی جو قرآن کے اس نظام کو لے کر اٹھیگا۔ جھکڑ اور آندھیاں درختوں کو جڑ سے اکھیڑ سکتی ہیں لہلہاتی کھیتیاں پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو جماعت اس راز کو پالے گی وہی نوعِ انسانی کی نفع بخشیوں کا ذریعہ بنے گی اور ثبات و بقا اسی کے حصے میں آسکے گی۔

(✻)

پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں، محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم ہر اتوار کی صبح بوقت ۸ بجے
۲۵/بی - گلبرگ ۲ - لاہور میں ہوتا ہے۔

(ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام)

(خواتین کیلئے پردے کا انتظام بھی ہوتا ہے)

وقف کی دینی حیثیت

پرویز

اسلامی مشاورتی کونسل کے صدر محترم علاؤ الدین صدیقی صاحب کیطرف سے مجھے حسب ذیل چٹھی موصول ہوئی۔

محترم المقام جناب غلام احمد پرویز صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ وبرکاتہٗ۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہونگے۔

اسلامی مشاورتی کونسل کے آئندہ اجلاس میں قانونِ جوازِ وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء (THE MUSSALMAN WAQF VALIDATING ACT, 1913) کی دفعات پر غور کرنا طے پایا ہے اور اس ضمن میں مندرجہ ذیل تنقیحات زیرِ غور آئیں گی۔

(۱) آیا قرآن وسنت میں وقف علی الاولاد کے بارے میں کوئی حکم ہے۔

(۲) آیا بصورتِ دیگر یہ فقہ کا ایسا جزو لاینفک ہے کہ اگر کوئی شخص وقف علی الاولاد قائم کردے تو حکومت پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ نافذ بھی کرے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا حکومت اس مسئلہ میں کوئی مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔

اس سلسلے میں یہ عرض کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قانونِ جوازِ وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء کے متعلق ایک خیال یہ ہے کہ یہ قانون اب از کار رفتہ ہونے کی وجہ سے اپنی افادیت کھو چکا ہے اس لئے اس کو منسوخ کر دینا ہی مناسب ہے۔ اس خیال کی رو سے قانونِ ہذا کی بدولت وقف علی الاولاد ایک عرصہ دراز کے بعد واقف کے ورثاء کو محسوس فوائد پہنچانے کے بجائے اس کے بالکل برعکس ثمرات مرتب کرتا ہے۔ اس لئے کہ دو یا تین پشتیں گذرنے کے بعد منتفعین کی تعداد اس قدر کثیر ہو جاتی ہے کہ اس جائیداد سے، جو کسی وقت واقف کے معدودے چند ورثاء کی ایک ٹھوس آمدنی کا ذریعہ تھی، ورثاء کی تعداد زیادہ ہونے کے سبب معمولی گذارے کی آمدنی کا ذریعہ بھی نہیں رہتی۔ لہٰذا نفع اٹھانے والے ورثاء جائیداد موقوفہ کے تحفظ اور بہتری میں دلچسپی لینا ترک کر دیتے ہیں اور اس طرح اس وقف کا مطلب

فوت ہو جاتا ہے۔

کونسل کو اس مسئلہ میں آپ کی گراں قدر رائے درکار ہے۔ امید ہے کہ آپ اس موضوع پر قرآن و سنت کی روشنی میں ایک جامع، مکمل اور مدلل مقالہ لکھ کر کونسل کے دفتر کو جلد از جلد ارسال فرمائیں گے جس میں آپ کی قطعی رائے قانون ہذا کے منسوخ کرنے یا نہ کرنے کے متعلق بھی دی گئی ہو۔

کونسل اس سلسلے میں آپ کی گرانقدر مساعی پر آپ کی بے حد ممنون ہوگی، اور اپنے قواعد کی رو سے آپ کی خدمت میں ایک حقیر سا معاوضہ بھی پیش کرنے کی جرأت کریگی۔ ممکن ہے کہ آپ کو اس سلسلہ میں کونسل کی میٹنگ میں تشریف لانے کی زحمت بھی دیجائے جس کے لئے کونسل آپ کو بروقت اطلاع دے گی اور آپ کے آنے جانے اور قیام کے مصارف کا بھی انتظام کریگی۔

قانونِ جوازئ وقفِ مسلمانان مصدرہ ۱۹۱۳ء کی ایک ٹائپ شدہ نقل آپ کے مطالعے کے لئے اس خط کے ساتھ منسلک کی جا رہی ہے۔"

میں نے اسے حسبِ ذیل جواب بھیجا ہے۔

محترمی جناب صدیقی صاحب۔

السلام علیکم! — آپ کا گرامی نامہ (نمبر ۳(۱)/۷۰ - - اے سی۔ آئی۔ آئی۔ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۷۰ء) شرفِ صدور لایا۔ اس میں آپ نے قانونِ جوازئ وقف مصدرہ ۱۹۱۳ء کے سلسلہ میں حسبِ ذیل تنقیحات کے متعلق میری رائے دریافت فرمائی ہے۔

(۱) آیا قرآن وسنت میں وقف علی الاولاد کے بارے میں کوئی حکم ہے؟

(۲) آیا بصورتِ دیگر یہ فقہ کا ایسا جزو لاینفک ہے کہ اگر کوئی شخص وقف علی الاولاد قائم کرے تو حکومت پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو نہ صرف تسلیم کرے بلکہ نافذ بھی کرے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا حکومت اس مسئلہ میں کوئی مداخلت کرنے کی مجاز نہیں۔

چونکہ زیرِ نظر سوال قانونِ جوازئ وقف مصدرہ ۱۹۱۳ء کی تنسیخ سے متعلق ہے اس لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس بحث کو وقف علی الاولاد تک محدود رکھنے کے بجائے خود نفسِ وقف کا جائزہ لے لیا جائے۔ لہٰذا میرا جواب وقف کی اِس مخصوص (علی الاولاد) حیثیت کے بجائے، اس کی عمومی حیثیت سے متعلق ہوگا یعنی وقف، خواہ وہ کسی مقصد کے لئے ہو۔

(۱) عام طور پر وقف کی تعریف (DEFINITION) یہ کی جاتی ہے کہ الوقف لا یملک ولا یباع ولا یوھب ولا یورث۔ یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے، نہ اسے فروخت کیا جا سکتا ہے، نہ ہبہ

کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پر قانونِ وراثت کا اطلاق ہوتا ہے۔

(۳) قرآن کریم کی رو سے، مال یا جائیداد پر افراد کی ذاتی ملکیت کا تصور کیا ہے، یہ سوال وسیع اور دقیق ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ مسئلہ زیر نظر پر غور و خوض کے لئے، میں اس نقطہ سے آگے بڑھتا ہوں کہ اسلامی حکومت جس شے پر کسی کی ذاتی ملکیت تسلیم کرے اور اسے دوسروں کی طرف منتقل کرنے کا اختیار دے دے، اس کے کسی دوسرے کی طرف انتقال کی صورت میں حق ملکیت کی پوزیشن کیا ہوگی؟

قرآن کریم میں انتقال مال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں، ان میں کوئی شکل بھی ایسی نہیں کہ مال تو دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے لیکن اس پر ملکیت اس کی قائم نہ ہو۔ مثلاً خرید و فروخت، تحفہ، خیرات، قرضہ، وصیت یا وراثت وغیرہ کی رو سے جو شے بھی دوسرے کی طرف منتقل ہوجائے گی۔ وہ قانوناً اس کا مالک متصور ہوگا۔ (شئے مستعار کی حیثیت بالکل الگ ہے) لہذا قرآن کی رو سے وقف کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوسکتی۔

(۴) اب رہا سنت کا سوال، سو سنتِ رسول اللہ کے تعین (بلکہ تعریف تک) میں علماء میں جو اختلاف چلا آرہا ہے وہ آپ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ سنت حدیث ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور بعض کے نزدیک سنت احادیث سے مرتب ہوتی ہے۔ ائمہ حدیث نے متنِ حدیث کے پرکھنے کے لئے جو اصول متعین فرمائے ہیں، ان میں ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ قرآن کے خلاف نہ ہو۔ مسئلہ زیر نظر میں جب یہ واضح ہوگیا کہ قرآن کریم کی رو سے وقف کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تو پھر کتب روایات میں اگر کوئی روایت ایسی ملے جو وقف کی تائید میں ہو تو اس کے متعلق یہی سمجھا جانا چاہیئے کہ اس کی نسبت رسول اللہ کی طرف صحیح نہیں۔ ہاں یہ کہ وہ قرآنی احکام نازل ہونے سے پہلے کی بات ہے، جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت سے ظاہر ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ سورہ نساء میں احکامِ وراثت نازل ہوجانے کے بعد حضورؐ نے حبس کی ممانعت فرما دی تھی۔

(۵) جہاں تک فقہ کا تعلق ہے تو اس کے لئے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ فقہ کی پوزیشن کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں (مستثنیات کو چھوڑ کر) عام طور پر اصولی احکام دیئے گئے ہیں۔ اور یہ چیز اسلامی مملکت پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے حالات کے مطابق تفصیلی احکام خود مرتب اور نافذ کرے۔ ان تفصیلی احکام کو فقہ سے تعبیر کیا جاتا ہے (خواہ وہ انفرادی طور پر مرتب کئے گئے ہوں یا حکومت کی طرف سے)۔ ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کے اصول تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان کی روشنی میں وضع کردہ فقہی احکام کے متعلق ہر دور کی اسلامی حکومت مجاز ہوگی کہ وہ ان احکام میں مناسب رد و بدل کرے یا

اُن کی جگہ دوسرے احکام نافذ کر دے۔ ان احکام کے وضع کرنے میں یہ اسلامی حکومت سابقہ زمانوں میں مرتب شدہ احکام سے استفادہ کرے گی۔ لیکن اس کی پابند نہیں ہوگی کہ من وعن انہی احکام کو اختیار اور نافذ کرے۔ اس سے واضح ہے کہ اگر آج کوئی اسلامی حکومت وقف سے متعلق فقہی احکام کو منسوخ کرنا چاہے تو وہ اس کی مجاز ہوگی۔

(۶) جہاں تک "حکمت" کا تعلق ہے "مردہ بدستِ زندہ" تو ایک بدیہی بات ہے۔ لیکن وقف میں "زندہ بدست مردہ" ہوتا ہے۔ مرنے والا ایک حکم صادر فرما دیتا ہے کہ میری جائیداد نہ ورثاء میں تقسیم ہو سکتی ہے، نہ فروخت۔ یہ ابدالآباد تک میری ملکیت متصور ہوگی اور اس سے حاصل شدہ منافع میری مرضی کے مطابق فلاں مصرف میں لائے جائینگے۔ اب زمانے کے حالات کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں، زندہ انسان اُس مردہ کے فیصلے سے سرمو سرتابی نہیں کر سکتے ــــ نہ افراد، نہ معاشرہ اور نہ ہی حکومت۔ کسی جائیداد کے اس طرح منجمد ہو جانے کے جو نقصانات ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ وقف علی الاولاد سے جو نقصانات ہوتے ہیں ان کی نشان دہی آپ نے اپنی چٹھی میں خود ہی فرما دی ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ (قومی اور اجتماعی) نقصانات کا موجب وہ جائیدادیں ہیں جو "نیک مقاصد" کے لئے موقوف ہوں۔ نہ صرف یہ کہ قوم اُن سے کماحقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتی، وہ ان کی وجہ سے پیدا شدہ مضرتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے، لیکن قانونِ وقف کی پابندیوں کی وجہ سے کچھ کر نہیں سکتی۔

(۷) اندریں حالات میری رائے یہ ہے کہ

(i) حکومتِ پاکستان وقف کے غیر قرآنی قانون کو منسوخ کر دے۔

(ii) وقف علی الاولاد جائیدادیں ان کے موجودہ ورثاء کی طرف منتقل کر دے۔ اور

(iii) دیگر تمام موقوفہ جائیدادوں کو حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں اپنی صوابدید کے مطابق رفاہِ عامہ کے کاموں میں صرف کرے۔

(۸) آپ نے لکھا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل میری اس رائے کے لئے کوئی معاوضہ بھی پیش کرے گی۔ میں کونسل کی اس پیش کش کے لئے شکر گزار ہوں۔ لیکن اسے قبول کرنے سے معذرت چاہوں گا۔

(۹) اسی ضمن میں ایک اضافہ کی اجازت چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں صاحبِ جائیداد کو جو مشکلات پیش آتی ہیں اور جن کے حل کے لئے وہ کبھی ہبہ کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کبھی وقف کا۔ جہاں تک میں نے دیکھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے قرآنِ کریم کے قانونِ وصیت کو پسِ پشت ڈال رکھا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اتنی سخت تاکید کی ہے۔ اگر قرآن کے قانونِ وصیت کو کاملۃً نافذ کر دیا جائے تو کسی کو اس قسم کی گریز کی

راہوں کی ضرورت ہی لاحق نہ ہو۔

یہ بھی واضح رہے کہ اس قسم کے اصلاحی اقدامات کی ضرورت اس لئے پیش آرہی ہے کہ ہمارے ہاں قرآن کا معاشی نظام نافذ نہیں۔ اس نظام کی موجودگی میں وہ تمام مشکلات از خود حل ہو جاتی ہیں جو اس وقت ہمارے لئے اس قدر دردسری کا موجب بن رہی ہیں۔

(۱۰) چونکہ آپ کی چٹھی "صیغہ راز" کی نہیں اس لئے میں استفادہ عام کی غرض سے اسے اور اپنے اس جواب کو طلوع اسلام میں اشاعت کے لئے دے رہا ہوں۔ امید ہے آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

تکملہ

چٹھی کا جواب تو میں نے ان تنقیحات تک محدود رکھا جن کے متعلق میری رائے دریافت کی گئی تھی۔ لیکن قارئین طلوع اسلام کے لئے چند ایک نقاط کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) دینی مقاصد کے لئے جو کچھ وقف کیا جائے گا ظاہر ہے کہ وہ یا زمین کی شکل میں ہوگا یا جائیداد کی شکل میں، یا سرکاری تمسکات کی شکل میں اور یا پھر کسی کاروبار میں روپیہ (INVEST) کیا ہوگا یا کسی صنعتی ادارے کے حصے خریدے ہوں گے۔ ان میں سے کوئی شکل بھی ہو ظاہر ہے کہ اس میں اصل تو محفوظ رہے گا اور جو کچھ حاصل ہوگا وہ اس اصل پر منافع ہوگا۔ قرآن کریم صرف سرمایہ پر منافع کو خواہ وہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو ربٰوا قرار دیتا ہے۔ اس لئے موقوفہ جائیداد وغیرہ سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ قرآن کریم کی رو سے ربٰوا ہوگا۔ ہماری مروجہ فقہ اس قسم کے منافع کو جائز قرار دیتی ہے۔ لیکن اس کے جواز کی دلیل صرف یہ ہے کہ اسے وہ ربٰوا کے نام سے نہیں پکارتی بلکہ مزارعت یا مضاربت جیسی اصطلاحات سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ محض الفاظ کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ ربٰوا ربٰوا ہی رہتا ہے خواہ اسے کسی اصطلاح سے بھی کیوں نہ پکارا جائے۔ مسلمانوں کا اس طرح جائیدادوں کو وقف کرنا، اور پھر حکومت کی طرف سے ایک محکمہ قائم کرنا تاکہ وہ ربٰوا کے اس کاروبار کا نظم و نسق سنبھالے اور اس سے حاصل شدہ پیسے کو "دینی" مقاصد میں صرف کرنا جس قدر خیر و برکت کا موجب ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

(۲) وصیت کے متعلق قرآن کریم میں بنص صریح کہا گیا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔ (۲/۱۸۰) یعنی جب کسی کے سامنے موت آموجود ہو تو اس پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے والدین اور اقربین کے لئے اپنے ترکہ کی وصیت کرے۔ اور ایسا کرنا متقیوں کے لئے لازم ہے۔ پھر (۴/۱۱) میں تفصیل سے کہا گیا ہے کہ یہ وصیت کس طرح لکھائی جائے گی اور اس میں شاہد کون کون سے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اور سورۂ نساء میں جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر ہے،

ہر حصے کے بعد یہ کہا گیا ہے کہ "تقسیم وصیت پوری کرنے کے بعد جو کچھ بچے گا" اس کی کی جائے گی۔ لیکن قرآن کریم کے ایسے واضح اور تاکیدی احکامات کے خلاف ہماری مروجہ فقہ یہ کہتی ہے کہ وصیت صرف ⅓ مال ہی کی جا سکتی ہے اور وہ بھی وارثوں کے لئے نہیں۔ آپ خود سوچئے کہ اسے کیا کہا جائے؟

(۳) میں نے اپنے جواب میں ضمناً یہ کہا ہے کہ یہ تمام مشکلات اس وقت تک پیدا ہوتی رہیں گی جب تک قرآن کریم کا معاشی نظام رائج نہیں ہوگا۔ اس نظام میں نہ زمین اور دیگر وسائل پیداوار پر کسی کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی کے پاس فاضلہ روپیہ رہتا ہے کہ وہ جائیدادیں کھڑی کرے، یا اسے کاروبار میں منافع پر لگائے۔ اس نظام میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے اور اسلامی مملکت اس کی اور اس کے بال بچوں کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کی کفیل ہوتی ہے۔

انسانی مسائل کے حل ہیں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطونِ اعظم سے لے کر آج تک گزشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مؤرخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟
اسے پڑھئے اور سوچئے کہ وحی کی روشنی سے رو گرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت
بارہ ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ
ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

رفیع اللہ

علمائے کرام ـــــ امام غزالیؒ کی نگاہ میں

(قسطِ دوم)

قسطِ اوّل طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۰ء میں شائع ہو چکی ہے!

آٹھ مسائل

امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ شاگرد کو ویسا ہونا چاہیے جیسا کہ جناب شفیق بلخیؒ کے شاگرد حاتم اصمؒ تھے۔ روایت کی گئی ہے کہ ایک دن شفیقؒ نے حاتمؒ سے دریافت فرمایا کہ تم کتنے عرصے سے میری صحبت میں ہو۔ انہوں نے جواب دیا تینتیس برس سے۔ شفیقؒ نے پوچھا کہ اس عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا ہے۔ حاتمؒ نے کہا صرف آٹھ مسئلے۔ انہوں نے اِنّا للہ پڑھا اور فرمایا کہ تیرے ساتھ میری زندگی گذر گئی اور تو نے صرف آٹھ مسائل سیکھے۔ حاتمؒ نے کہا کہ اے استاد! اس سے زیادہ میں نے نہیں سیکھے اور غلط بیانی کو میں ناپسند کرتا ہوں۔ انہوں نے پوچھا کہ وہ آٹھ مسئلے کون کون سے ہیں تاکہ مجھے بھی معلوم ہوں۔ حاتمؒ نے کہا کہ:۔

(۱) پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے انسانی مخلوق کو دیکھا تو معلوم کیا کہ ہر شخص کا ایک محبوب ہوتا ہے اور وہ قبر تک اپنے محبوب کے ساتھ رہتا ہے۔ جب قبر میں پہنچ جاتا ہے تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے میں نے نیکیوں کو اپنا محبوب بنا لیا ہے کہ جب میں قبر میں جاؤں تو میرا محبوب میرے ساتھ رہے۔ شفیقؒ نے فرمایا کہ تو نے بہت اچھا سیکھا۔ باقی مسائل کونسے ہیں۔

(۲) آپ نے کہا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے اس آیت شریفہ پر غور کیا۔ "وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى" اور جو کوئی اپنے رب کے حضور کھڑا ہونے سے ڈرا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا تو بہشت اس کا ٹھکانا ہے؛ تو میں نے جان لیا کہ ارشادِ ربانی حق ہے سو میں نے اپنے نفس کو خواہشات سے دور رکھنے کی عادت ڈالی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ کی اطاعت پر جم گیا۔

(۳) تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے جب انسانی مخلوق کی طرف دھیان دیا تو یہ دیکھا کہ جس شخص کے پاس

کوئی قدر و قیمت کی چیز ہوتی ہے تو وہ اسے سنبھال کر رکھ چھوڑتا ہے تاکہ محفوظ رہے۔ پھر اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ (اور جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے باقی رہنے والا ہے) تو جو کچھ قدر و قیمت کی کوئی چیز میرے ہاتھ آتی میں نے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا تاکہ اسکے پاس باقی اور محفوظ رہے۔

(۴) اور چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے بنی نوع انسان کو غور سے دیکھا تو یہ حقیقت ظاہر ہوئی کہ ان میں سے ہر شخص مال و دولت اور حسب نسب کی طرف میلان رکھتا ہے اور جب میں نے ان امور پر غور و فکر کیا تو ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں تھی۔ پھر میں نے اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰكُمۡ۔ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔) اس لئے میں نے تقویٰ اختیار کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کریم ہو جاؤں۔

(۵) اور پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو ایک دوسرے پر بدگمانی کرتے ہوئے دیکھا۔ اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور اس تمام برائی کی جڑ حسد ہے اور پھر میں نے اس فرمانِ الٰہی پر غور کیا نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا۔ (ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کا رزق تقسیم کیا) اس لئے میں نے حسد چھوڑ دیا اور مخلوق سے اجتناب کیا اور جان لیا کہ تقسیمِ رزق تو اللہ پاک کی طرف سے ہے، اس لئے میں نے مخلوق سے عداوت چھوڑ دی۔

(۶) اور چھٹا مسئلہ یہ ہے کہ میں نے دیکھا کہ بنی نوعِ انسان ایک دوسرے پر سرکشی اور کشت و خون کرتے ہیں۔ اور فرمانِ باری تعالیٰ کی طرف رجوع کیا تو فرمایا ہے کہ اِنَّ الشَّيۡطٰنَ لَكُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡهُ عَدُوًّا۔ (تحقیق شیطان تمہارا دشمن ہے پس تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو)۔ اسی بنا پر میں نے صرف اس اکیلے کو اپنا دشمن تصور کر لیا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بذاتِ خود اس کی دشمنی پر گواہی دی ہے کہ وہ میرا دشمن ہے اس لئے میں نے تمام مخلوق کی عداوت چھوڑ دی۔

(۷) ساتواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا کہ ان میں ہر ایک روٹی کے ایک نوالے کے لئے اپنے نفس کو ذلیل کرنے والا ہے اور اس کے لئے حرام امور کے ارتکاب سے بھی دریغ نہیں کرتا، تو میں نے اس ارشادِ ربانی پر غور کیا۔ وَمَا مِنۡ دَآبَّةٍ فِى الۡاَرۡضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزۡقُهَا۔ (روئے زمین پر ہر چلنے والے کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے) اور میں نے سمجھ لیا کہ میں بھی انہی روئے زمین پر چلنے والوں میں سے ہوں جن کے رزق کا وہ ذمہ دار ہے۔ اس لئے میں حقوق اللہ کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے حقوق اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیئے۔

(۸) اور آٹھواں مسئلہ یہ ہے کہ میں نے بنی نوعِ انسان کو دیکھا تو ان میں ہر کوئی اپنے جیسی مخلوق پر بھروسہ

کئے ہوئے ہے۔ کوئی اپنی زمین پر، کوئی اپنی تجارت پر، کوئی اپنی صنعت گری پر اور کوئی اپنے بدن کی تندرستی پر۔ غرضیکہ تمام مخلوق اپنے جیسی دوسری مخلوق کا سہارا لئے ہوئے ہے۔ تو میں نے اس فرمانِ ربانی کی طرف رجوع کیا۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔ (کہ جو اللہ تعالےٰ پر توکل کرے تو وہ اس کے لئے کافی ہے) اس لئے میں نے اللہ تعالےٰ پر توکل کیا کہ صرف وہی مجھے کافی ہے۔

اس پر آپ کے استاذ جناب شقیق بلخی رحمۃ نے فرمایا کہ اے حاتم! اللہ تعالےٰ تجھے توفیق دے کہ میں نے تمام آسمانی کتابوں کے علوم پر نظر کی تو میں نے نیکی اور دیانت کی تمام اقسام کو انہی آٹھ مسئلوں کے گرد گھومتا پایا جس نے ان پر عمل کیا اس نے گویا چاروں الہامی کتابوں پر عمل کیا۔ اور حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے ادراک اور حصول کے لئے علمائے حق ہی کوشش کرتے ہیں اور دنیا دار علماء تو صرف ان امور میں مشغول ہوتے ہیں جن سے دنیاوی مال و مرتبہ آسانی سے حاصل ہو سکے۔ اور اس قسم کے علوم کو چھوڑ دیتے ہیں جن کے لئے اللہ تعالےٰ نے اپنے تمام انبیاء کو مبعوث فرمایا ہے۔

ایک عیش پرست فقیہہ کا قصہ

ضحاک بن مزاحم فرماتے ہیں کہ سلف صالحین ایک دوسرے کو پرہیزگاری کے سوا کچھ نہیں سکھاتے تھے۔ اور آج بجز فلسفہ کے کچھ نہیں سیکھتے۔ اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ کھانے پینے میں آسائش، لباس میں شان و شوکت اور ساز و سامان اور رہائش گاہ کے معاملے میں زینت کی طرف مائل نہ ہوں۔ بلکہ ان سب امور میں میانہ روی اختیار کریں اور اس بارے میں سلف صالحین سے مشابہت پیدا کریں۔ اور سب امور مذکورہ میں کم سے کم مقدار پر کفایت کریں کیونکہ جس قدر ان چیزوں کی خواہش کم ہو گی اسی نسبت سے اللہ تعالےٰ کا قرب زیادہ ہو گا اور اسی طرح علمائے حق میں اس کا مرتبہ بلند ہو گا اور یہ قصہ اس امر پر شاہد ہے جو حاتم اصم کے شاگرد ابو عبداللہ خواص روایت کرتے ہیں کہ میں حاتم کے ساتھ شہر رے میں گیا۔ ہمارا قافلہ جو تین سو بیس آدمیوں پر مشتمل تھا حج کا ارادہ رکھتا تھا۔ سب کے سب کمبل پوش تھے کسی کے پاس توشہ دان یا کھانا نہیں تھا۔ ہم ایک سوداگر کے گھر اترے جو زیادہ دولتمند نہیں تھا، غریب دوست تھا۔ اس نے اس رات ہماری ضیافت کی۔ جب صبح ہوئی تو اس نے حاتم سے کہا کہ اگر کوئی ضرورت ہو تو ارشاد فرما دیجئے کہ میں اپنے ایک بیمار فقیہہ کی بیمار پرسی کو جانا چاہتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ بیمار پرسی کار ثواب ہے اور فقیہہ کو دیکھنا عبادت میں شامل ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں اور وہ بیمار فقیہہ محمد بن مقاتل قاضی رے تھا۔ جب ہم دروازے پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ ایک خوبصورت بلند و بالا محل تھا۔ حاتم ششدر رہ گئے کہ ایک عالم دین کا ایسا دروازہ! پھر جب اجازت کے بعد اندر گئے تو دیکھا کہ مکان خوبصورت اور بڑا وسیع تھا۔ قالین بچھے ہوئے اور پردے لگے ہوئے تھے۔ حاتم پہلے سے بھی زیادہ حیران ہوئے۔ پھر قاضی صاحب کے ڈرائنگ روم میں گئے جس میں نرم قالین بچھا ہوا تھا اور وہ اس پر لیٹے ہوئے تھے اور سر کے پاس ایک

نوکر لڑکا پنکھا لئے کھڑا تھا۔ سو اگر قاضی صاحب کے سرہانے بیٹھ کر حال احوال پوچھنے لگا لیکن حاتم کھڑے رہے۔ قاضی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن آپ نے بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر قاضی نے پوچھا کہ کیا تمہیں کوئی حاجت ہے؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا کہ ایک مسئلہ پوچھنا ہے بشرطیکہ آپ اٹھ کر بیٹھ جائیں۔ جب قاضی صاحب اٹھ کر بیٹھ گئے تو حاتم نے کہا کہ تم نے علم کس سے سیکھا ہے؟ جواب دیا کہ معتبر علماء سے دین سے جنہوں نے میرے سامنے احادیث بیان کیں۔ حاتم نے پوچھا کہ انہوں نے کس سے احادیث روایت کی تھیں۔ قاضی نے جواب دیا صحابہؓ رسولؐ سے۔ آپ نے پھر پوچھا کہ صحابہؓ نے کس سے روایت کی تھیں۔ قاضی نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے جنہوں نے جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کیا تھا۔

اس پر حاتم نے فرمایا کہ جو علم اللہ تعالیٰ سے جبرئیل علیہ السلام نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پہنچایا اور آپ نے صحابہؓ کو اور انہوں نے معتبر علماء کو جنہوں نے اسے تجھ تک پہنچایا تو کیا تم نے اس علم میں کہیں یہ بھی دیکھا سنا ہے کہ جس شخص کے گھر کی کرسی بلند ہو اور وہ بڑا وسیع ہو تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑا ہوتا ہے؟ قاضی نے کہا کہ نہیں، میں نے ایسا کہیں نہیں سنا۔ حاتم نے دوبارہ پوچھا کہ پھر آپ نے کیا سنا ہے؟ قاضی نے کہا کہ یوں سنا ہے کہ جو شخص دنیا میں زہد اختیار کرے اور آخرت کی خواہش رکھے اور مساکین سے محبت رکھے اور آخرت کے لئے تیاری کرے تو اس کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلند ہوگا۔ حاتم نے فرمایا کہ پھر تم نے کس کی پیروی کی ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ اور سلف صالحینؒ کی یا نمرود اور فرعون کی جنہوں نے سب سے پہلے اینٹوں اور چونے کے محل بنائے تھے۔ اے عالم باطل! دنیا پر حریص اور جاہل لوگ جو دنیا کے لئے لڑتے ہیں وہ تمہیں جیسے لوگوں کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ ہم اگر ان علماء سے بدتر ہیں تو اس میں کیا حرج ہے۔ یہ کہہ کر حاتم اس کے پاس سے چلے آئے۔ اور قاضی ابن المقاتل کی بیماری اور بڑھ گئی اور رے کے لوگوں کو قاضی اور حاتم کی گفتگو کا علم ہوا تو انہوں نے کہا کہ قزوین کا قاضی طنافسی تو اس سے بھی زیادہ

اسراف کے متعلق فقہا کا نظریہ

عیش پرست ہے۔ پس حاتم قصداً اس کے پاس گئے اور سلام و رحمت کے بعد درخواست کی کہ میں ایک عجمی شخص ہوں۔ مجھے وضو کی عملی تعلیم دیجئے۔ طنافسی نے کہا بہت بہتر۔ اور نوکر لڑکے سے کہا کہ ایک برتن میں پانی لے آؤ۔ جب پانی آ گیا تو طنافسی نے بیٹھ کر وضو کیا اور ہر عضو کو تین تین بار دھویا اور پھر کہا کہ اس طرح وضو کرتے ہیں۔ حاتم نے کہا کہ اس مسئلہ کو پختہ کرنے کے لئے آپ کے سامنے وضو کرتا ہوں چنانچہ فقیہہ طنافسی کھڑے رہے اور حاتم وضو کرنے بیٹھے اور آپ نے وضو میں اپنے ہاتھوں کو چار چار مرتبہ دھویا۔ طنافسی نے اعتراض کیا کہ تم نے اسراف سے کام لیا ہے۔ حاتم نے پوچھا کیسے، تو اس نے کہا کہ تم نے اپنے ہاتھ تین کی بجائے چار مرتبہ دھوئے۔ حاتم نے کہا سبحان اللہ! میں نے ایک چلو پانی میں اسراف کیا اور تم نے عیش پرستی کے ان سب سامانوں کے جمع کرنے میں اسراف نہیں کیا۔ اب طنافسی اس

حقیقت کو پہنچ گیا کہ ان کا مقصد وضو سکھانا نہ تھا بلکہ یہی امر جتانا مقصود تھا۔ یہ سنکر وہ گھر میں داخل ہو گئے اور شرم سے چالیس روز تک لوگوں کے سامنے نہ آئے۔

پھر جب حاتمؒ بغداد تشریف لے گئے تو اہل بغداد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اے ابو عبدالرحمٰن! تم ایک عجمی شخص ہو اور تتلا کر بات کرتے ہو مگر جو بھی تم سے بحث کرتا ہے تم اسے کاٹ کر رکھ دیتے ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ میں تین ایسی خصلتیں ہیں جن کی وجہ سے میں فریقِ مخالف پر غالب رہتا ہوں۔ پہلی یہ کہ جب میرا دشمن صحیح بات کہتا ہے تو میں خوش ہوتا ہوں۔ اور دوسری یہ کہ جب وہ غلطی کرتا ہے تو مجھے رنج ہوتا ہے۔ اور تیسری یہ کہ میں اپنے آپ کو قابو میں رکھتا ہوں کہ مخالف فریق پر کوئی زیادتی نہ کر بیٹھوں۔ یہ خبر جب امام احمد بن حنبلؒ تک پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ سبحان اللہ! بڑے عاقل شخص معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں بھی ان کی خدمت میں لے چلو۔ جب یہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام احمدؒ نے آپ سے دریافت کیا کہ سلامتی کس بات میں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اے ابو عبداللہ! جب تک آپ میں چار خصلتیں نہ ہوں گی، دنیا میں سلامتی سے نہ رہو گے (۱) لوگ زیادتی کریں تو تم درگذر کرو (۲) دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ (۳) اپنی چیزیں دوسروں کے لئے خرچ کرو۔ (۴) لیکن ان سے ان کی چیزوں کی کبھی توقع نہ رکھو۔ جب تم ان پر عمل کرو گے تو ان شاء اللہ اس دنیا میں سلامت رہو گے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے محلات؟

پھر حاتمؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اہل مدینہ آپکے استقبال کو آئے تو آپ نے دریافت کیا کہ یہ کون سا مدینہ ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ مدینۃ الرسول (صلے اللہ علیہ وسلم) ہے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور صلعم کا محل کہاں ہے؟ تاکہ میں اس میں نماز پڑھ لوں۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کا تو کوئی محل نہ تھا بلکہ آپ کا گھر تو بہت پست تھا۔ حاتمؒ نے کہا کہ صحابہؓ رسولؐ کے محلات ہی بتا دو۔ انہوں نے کہا ان کے بھی کوئی محل نہیں تھے بلکہ ان کے مکانات تو زمین سے لگے ہوئے تھے۔ حاتمؒ نے کہا کہ لوگو! تو پھر یہ شہر فرعون کا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ اسے پکڑ کر حاکم شہر کے پاس لے گئے اور شکایت کی کہ یہ عجمی کہتا ہے کہ یہ مدینہ فرعون کا ہے۔ حاکم نے کہا کس لئے ایسا کہتا ہے۔ حاتمؒ نے کہا جلدی نہ کرو۔ میں ایک عجمی مسافر ہوں۔ جب شہر میں آیا تو لوگوں سے پوچھا یہ کس کا مدینہ ہے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ مدینۃ النبی صلعم ہے۔ میں نے کہا حضور کا محل کہاں ہے اور سب ماجرا تفصیلاً بیان کیا پھر فرمایا کہ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (تمہارے لئے اللہ کا رسول عمدہ نمونہ تھے) تم نے کس کا اتباع کیا ہے؟ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یا فرعون کا جس نے سب سے پہلے اینٹوں اور چونے کے محل بنائے۔ تو حاکم شہر نے لاجواب ہو کر آپ کو رہا کر دیا۔

زینت حرام نہیں ہے

ویسے زینت کے مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ یہ حرام نہیں بلکہ مباح ہے۔ لیکن جب انسان ہر طرف سے ہٹ کر صرف زینت کا ہو جائے تو اس سے اس کا ہوجانا

لازمی امر ہے۔ اس کے بعد اس کا ترک کرنا شاق گزرتا ہے۔ اور زینت اختیار کرنے کی وجہ سے انسان اکثر اس کے خیال کی وجہ سے مداہنت، مخلوق کی ناجائز طرف داری وغیرہ کا مرتکب ہو جاتا ہے اس لئے احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے اس لئے کہ جو دنیاداری میں غرق ہو جاتا ہے وہ اس سے صحیح سالم نہیں نکلتا۔ اگر دنیاداری میں پوری طرح منہمک ہو جانے کے باوجود سلامتی کا یقین ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترکِ دنیا میں مبالغہ نہ کرتے۔ یہاں تک کہ آپ نے دھاری دار کپڑا اتار دیا تھا اور خطبہ کے دوران سونے کی انگوٹھی بھی اتار دی تھی۔ وغیرہ۔

امام مالکؒ کی زینت کا جواز

کہتے ہیں کہ یحییٰ بن یزید نوفلی نے امام مالکؒ بن انس کو ایک خط لکھا جس کی عبارت یوں تھی۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم پر درود و صلوٰۃ۔ یحییٰ بن یزید نوفلیؒ کی جانب سے مالک بن انسؒ کے نام۔ حمد و صلوٰۃ کے بعد معلوم ہو کہ میں نے سنا ہے کہ تم باریک (نفیس) کپڑے پہنتے ہو اور پتلی پتلی چپاتیاں کھاتے ہو اور نرم بچھونے پر بیٹھتے ہو۔ اور اپنے دروازے پر دربان مقرر کرتے ہو۔ حالانکہ تمہاری مجلس علم کے لئے ہوتی ہے جس میں لوگ دور و نزدیک سے آتے ہیں جنہوں نے تمہیں اپنا امام بنا رکھا ہے اور وہ تمہارے اقوال پر راضی ہیں۔ تو تمہیں اللہ تعالےٰ کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیئے اور تواضع کو لازم پکڑنا چاہیئے میں نے یہ خط تمہیں بطور نصیحت لکھا ہے جسے اللہ تعالےٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" والسلام

امام مالکؒ کا جواب

امام مالکؒ بن انس نے اس خط کے جواب میں لکھا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وصلی اللہ علی محمد و آلہ و اصحابہ وسلم۔ مالک بن انس کی جانب سے یحییٰ بن یزید کی طرف۔ آپ پر اللہ تعالےٰ کا سلام ہو۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں آپ کی شفقت اور نصیحت کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو تقویٰ کی نعمت سے نوازے اور اس نصیحت کے عوض بھلائی دے۔ میں گناہوں سے بچنے کے لئے اللہ تعالےٰ کی توفیق چاہتا ہوں۔ آپ نے جو لکھا ہے کہ میں باریک کپڑے پہنتا ہوں، پتلی چپاتیاں کھاتا ہوں اور نرم فرش پر بیٹھتا ہوں اور دروازے پر دربان رکھتا ہوں، تو واقعی میں ایسا کرتا ہوں اور اللہ تعالےٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں۔ مگر باری تعالےٰ یہ بھی تو فرماتے ہیں۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (کس نے اللہ کی زینت کی چیزوں کو حرام کیا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیں اور پاکیزہ کھانے) یہ میں جانتا ہوں کہ ان چیزوں کا ترک کر دینا ان کے اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ اور آپ اپنی خط و کتابت سے ہمیں نہ بھولئے۔ ہم بھی خط و کتابت جاری رکھیں گے۔" (والسلام)

امام مالکؒ کا اقرار ملاحظہ ہو کہ تسلیم کر لیا کہ ان امور کا نہ کرنا' اختیار کرنے کی نسبت اچھا ہے اور یہ رائے بھی ظاہر کر دی کہ یہ امر مباح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اور جب امام مالکؒ جیسی شخصیت اپنی نصیحت میں انصاف سے کام لیں اور حق بات کا اعتراف کر لیں تو ان کا نفس مباح کی حدود کے قیام پر بھی قادر ہوگا۔ اور وہ مداہنت، دکھلاوا، اور مکروہات میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہیگا۔ مگر عام آدمی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ مباح کی حدود پر قائم رہے اس لئے مباح سے لذت حاصل کرنے میں بھی بہت خوف ہے اور علمائے حق کا ایک وصف خوف الٰہی ہے جو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ خطرہ کی جگہ سے دوری اختیار کی جائے۔

دنیاوی حاکم اور علمائے حق

علمائے حق کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ سلاطین سے دور رہیں اور جب تک ان سے علیحدہ رہنے کی صورت ممکن ہو ان سے دور ہی رہیں۔ بلکہ اگر وہ امرا خود بھی اس کی خدمت میں حاضر ہوں تب بھی ان سے ملنے سے احتراز کریں اس لئے کہ دنیا میٹھی اور سرسبز ہے جس کی باگیں حکام وقت کے پاس ہوا کرتی ہیں اور ان سے میل جول میں ان کی خوشنودی اور دلداری کا خیال رکھنا پڑ جاتا ہے حالانکہ وہ ظالم ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر عالم دین کو ان سے میل ملاپ سے انکار کرنا چاہیئے بلکہ ان کے مظالم کا اظہار اور ان کی بُری حرکات کی نشان دہی کر کے ان کے ہوش و حواس ٹھیک کرتے چاہئیں۔ لیکن جو ان سے میل جول بڑھائے گا وہ یا تو ان کی زینت کی طرف توجہ کرے گا اور اپنے اوپر نعمت الٰہی کو حقیر سمجھنے لگے گا، یا ان پر ناپسندیدگی کا اظہار کرنے سے خاموش رہے گا، تو مداہنت میں مبتلا ہوگا۔ یا ان کی خواہشات کے مطابق گفتگو کرنے کی کوشش کرے گا اور یہ واضح جھوٹ ہوگا۔ یا اس کو یہ لالچ ہو کہ اسے بھی دنیاوی ساز و سامان سے کچھ حاصل ہو اور یہ حرام ہے۔ اس کی تفصیلات کتاب حرام و حلال میں آئیں گی۔

مختصر یہ کہ دنیاوی حکمرانوں سے میل جول قائم کرنا برائیوں کی کنجی ہے اور علمائے حق اس بارے میں احتیاط کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس نے جنگل میں ڈیرا لگایا، اس نے ظلم کیا اور جو شکار کے پیچھے چلا اس نے غفلت کی اور جو بادشاہوں کی خدمت میں حاضر ہوا وہ فتنوں میں مبتلا ہوا۔ اور آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ایسے حکمران ہوں گے جن کے کاموں کو تم پہچانتے بھی ہو گے اور نہیں بھی پہچانتے ہو گے پس جس نے ان سے شناسائی نہ کی وہ بری ہے اور جس نے ان کو بُرا سمجھا وہ سلامت رہا لیکن جس شخص نے ان سے رضامند ہو کر ان کی تابعداری کی وہ اللہ تعالےٰ کی رحمت سے دور ہوا۔ کسی نے عرض کیا کہ ہم ان سے جہاد کریں۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں اور امام ثوریؒ فرماتے ہیں کہ دوزخ میں ایک وادی ہے جو صرف ان علماء کے لئے مخصوص ہے جو بادشاہوں سے میل ملاپ بڑھاتے ہیں اور حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو فتنہ کی جگہوں سے بچاؤ۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کون سی جگہیں ہیں۔ فرمایا۔ امیروں کے دروازے کہ جب تم میں سے

کوئی ان کے دروازے پر جاتا ہے تو جھوٹ پر اس کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی شان میں وہ باتیں کہتا ہے جن کا وہ اہل نہیں ہوتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علماء دین اللہ تعالے کے بندوں پر رسولوں کے امین ہیں جب تک کہ سلاطین سے میل جول نہ کریں۔ اور جب وہ ایسا کریں تو انہوں نے رسولوں کی خیانت کی۔ ایسے علماء سے ڈرو اور علیحدہ ہو جاؤ۔

امراء کے دروازے پر حاضری دینے والا عالم دین چور ہے

حضرت اعمش سے کسی نے کہا کہ آپ نے علم کو زندہ کر دیا ہے کیونکہ بہت سے لوگ آپ سے علم حاصل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ جلدی نہ کرو۔ جتنے لوگ علم حاصل کرتے ہیں ان میں سے ایک تہائی تو پختہ ہونے سے پہلے ہی وفات پا جاتے ہیں اور ایک تہائی سلاطین کے دروازوں پر جا جمتے ہیں۔ وہ لوگ تمام مخلوق سے بُرے ہیں۔ اور باقی تہائی میں سے کمتر ایسے ہیں جو فلاح پاتے ہیں اور اسی وجہ سے حضرت سعید بن المسیبؓ نے فرمایا کہ جب تم کسی عالمِ دین کو امراء پر گرتا پڑتا دیکھو تو اس سے احتراز کرو۔ کیونکہ وہ درحقیقت چور ہے۔ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالے کے نزدیک اس عالم دین سے زیادہ بُری مخلوق کوئی نہیں جو امراء کی زیارت کے لئے جائے اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بدترین علماء وہ ہیں جو امراء کے ہاں حاضری دیتے ہیں اور حکمرانوں میں سے بہترین وہ ہیں جو علماء کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور مکحول دمشقی کا فرمانا ہے کہ جو شخص قرآن مجید کا علم حاصل کرے اور دین میں تفقہ پیدا کرے اور پھر خوشامد کے لئے سلطان کی صحبت اختیار کرے اس چیز کے لالچ میں جو ان لوگوں کے اختیار میں ہوتی ہے تو وہ قدموں کے شمار کے لحاظ سے آگ کے سمندر میں گھستا ہے اور سمنون رحمتہ نے فرمایا کہ عالمِ دین کے حق میں یہ کتنا برا ہے کہ کوئی اس کی مجلس میں جائے تو وہ موجود نہ ہو۔ پوچھنے پر معلوم ہو کہ وہ امراء کے سلام کے لئے گیا ہوا ہے۔

علمائے اسرائیل سے بھی بدتر

اور آپ نے فرمایا کہ میں سنا کرتا تھا کہ جب کسی عالم دین کو دنیا سے محبت کرتے دیکھو تو دین کے معاملے میں اس پر اعتبار نہ کرو۔ اس حقیقت کا اب میں نے خود تجربہ کر لیا ہے۔ یعنی جب بھی میں کسی سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہاں سے نکلنے کے بعد اپنے نفس کا محاسبہ کیا تو میں نے اس اثر کو محسوس کیا حالانکہ میں جس طرح سلاطین سے ملتا ہوں تم اسے جانتے ہو کہ ان سے سختی سے پیش آتا ہوں اور اکثر حاکم کی خواہش کی مخالفت کرتا ہوں اور یہی چاہتا ہوں کہ اس تک جانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ان سے کچھ لینا بھی نہیں یہاں تک کہ ان کے ہاتھ کا پانی بھی نہیں پیتا۔ پھر فرمایا کہ ہمارے زمانے کے علماء اسرائیل کے علماء سے بھی بدتر ہیں کہ جیسی سلاطین کی خواہشات ہوں ان کے لئے شرعی جواز ڈھونڈتے ہیں اور اگر ان کو وہ باتیں سکھائیں جو ان پر واجب ہیں اور جن میں ان کی نجات ہے تو یہ حاکم ان علماء سے نفرت کریں اور انہیں

اپنے قریب نہ ہونے دیں حالانکہ یہ امر اللہ تعالیٰ کے نزدیک باعثِ نجات ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اپنے زمانے کے سلاطین کے پاس نہیں جاتے تھے اور ان سے نفرت کرتے تھے۔ آپ کے بیٹوں نے کہا کہ وہ لوگ جو اسلام اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہارے برابر نہیں وہ ان سلاطین کی خدمت میں جاتے ہیں۔ اگر آپ بھی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ آپ نے فرمایا۔ کیا میں بھی اس مردار کے پاس جاؤں جسے لوگوں نے گھیر رکھا ہے۔ اللہ کی قسم جب تک مجھ میں جان ہوتی میں ان کا شریک نہیں ہوں گا۔ بیٹوں نے کہا کہ تم لاغری میں مر جاؤ گے۔ فرمایا کہ ایمان کے ساتھ لاغری میں مرجانا اس سے اچھا سمجھتا ہوں کہ منافق ہو کر فربہ مروں۔ حسنؒ فرماتے ہیں کہ بخدا آپ نے اپنے بیٹوں کو لاجواب کر دیا۔ جب معلوم کر لیا کہ قبر کی مٹی گوشت اور چربی کو کھا جائے گی لیکن ایمان کو نہ کھائے گی۔ اور اس میں اس امر کی طرف بھی اشارہ ہے کہ سلاطین کی خدمت میں حاضر ہونے سے آدمی نفاق سے نہیں بچ سکتا جو ایمان کی ضد ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضرت سلمہؓ کو نصیحت کی کہ بادشاہوں کے دروازوں پر نہ جایا کرنا۔ اس لئے کہ تمہیں ان کی دنیا سے جبھی کچھ ملے گا جب وہ تمہارے دین سے اس سے بہتر لے لیں۔ اور علمائے دین کے لئے یہ امر ایک بڑا فتنہ ہے اور شیطان کا علماء پر ایک سخت حملہ ہے خاص کر وہ عالم دین جس کی آواز پیاری اور گفتگو میٹھی ہو۔ اس لئے کہ شیطان اسے ہمیشہ یہی سمجھاتا ہے کہ سلاطین کے پاس جانے اور ان کو نصیحت کرنے سے یہ لوگ ظلم سے باز رہیں گے اور وہ شعائرِ اسلامی قائم کریں گے، اور آخر کار ان کے دل میں یہ خیال پختہ کر دیتا ہے کہ تمہارا ان کے پاس جانا دین میں داخل ہے اور پھر جب ان کے پاس جاتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ ان سے نرم کلامی اور مداہنت نہ کی جائے اور ان کی تعریف اور خوشامد کی بات نہ کرے اور ان باتوں میں دین کی خرابی ہے۔ سلف صالحین فرمایا کرتے تھے کہ جب علماء علم حاصل کر لیتے تو عمل کرتے تھے اور عمل میں اس طرح مشغول ہو جاتے تھے کہ وہ گمنام ہو جاتے تھے۔ اور جب گمنام ہوتے تو لوگوں کو ان کی تلاش ہوتی۔ لیکن جب ان کی طلب ہوتی تو وہ بھاگ جایا کرتے تھے۔

علمائے حق اور حکومت

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت حسن بصریؒ کو ایک خط میں حمد و صلوٰۃ کے بعد یہ درخواست کی کہ آپ کچھ ایسے لوگوں کی طرف اشارہ فرما دیں جن سے میں خدا تعالیٰ کے امور میں مدد لیا کروں۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ اہلِ دین تو تمہارے پاس آئیں گے نہیں، اور دنیا دار علماء کی تجھے ضرورت نہیں۔ تاہم آپ اشراف کو اپنے ساتھ رکھیں کہ وہ لوگ اپنے شرف کو خیانت سے آلودہ نہیں کرتے۔ یہ حال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو لکھا گیا جو اپنے زمانے میں سب سے زیادہ پاک باز تھے۔ تو جب علمائے حق کو ایسے حاکم سے بھی گریز کرنا ضروری ہے تو دوسرے سلاطین کی طلب اور ان سے میل ملاپ کیسے مناسب ہوگا؟ اور سلف صالحین میں سے جناب حسن بصریؒ، امام سفیان ثوریؒ، جناب ابن مبارکؒ، جناب فضیلؒ، جناب ابراہیم بن ادھمؒ،

اور یوسف بن اسباطؒ مکہ شریف اور شام کے دنیا دار علماء کے یہ عیب گنایا کرتے تھے کہ وہ دنیا داری کی طرف مائل ہیں، یا سلاطین کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں وغیرہ۔

علمائے حق فتوے میں جلدی نہ کریں

اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ فتویٰ دینے میں جلدی نہ کریں۔ بلکہ جہاں تک ممکن ہو فتویٰ دینے سے بچنے کی کوشش کریں۔ پس اگر کوئی ایسا مسئلہ پوچھے جسے وہ قرآن مجید یا قطعی حدیث یا اجماع یا قیاس ظاہر کی بناء پر یقین کی حد تک جانتا ہو تب تو وہ بے شک فتویٰ دے دے۔ اور اگر ایسا مسئلہ ہو جس میں اسے شک ہو تو اسے کہہ دینا چاہیئے کہ میں نہیں جانتا۔ اور اگر کوئی ایسا مسئلہ دریافت کرے جس میں اسے اپنے اجتہاد اور اندازے میں کچھ شک ہو تو اس میں احتیاط کرے اور وہ کسے کسی بڑے عالم کے سپرد کر دے۔ یہ احتیاط کا درجہ ہے اس لئے کہ اجتہاد کا خطرہ اپنی گردن پر رکھنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ علم تین ہیں۔ ایک کتاب ناطق، دوسرا سنت جاریہ اور تیسرا لا اَدری (میں نہیں جانتا) کہنا۔ امام شعبی کہتے ہیں کہ لا ادری کہنا نصف علم ہے اور جو شخص کسی چیز کا علم نہ رکھتا ہو اور اللہ تعالےٰ کے لئے فتوے دینے سے چپ رہے تو اللہ کے نزدیک اس کا اجر صحیح فتوے دینے والے سے کم نہ ہوگا۔ اس لئے کہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا نفس کو سخت ناگوار گزرتا ہے۔ یہ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کی عادت۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے جب کوئی فتوے پوچھا جاتا تو آپ فرماتے کہ اس امیر کے پاس جاؤ جسے لوگوں کے معاملات سونپے گئے ہیں[1] مسئلہ اس کی گردن پر رکھو۔ اور حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص لوگوں کو ہر مسئلے میں فتویٰ دے اس کے مجنوں ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اور فرمایا کہ عالم کی ڈھال لا اَدری (میں نہیں جانتا) ہے۔ کیونکہ اگر وہ چوک جائے تو پھر اس کی خیر نہیں۔ ابراہیم بن ادہمؒ فرماتے ہیں کہ شیطان پر اس عالم سے سخت کوئی نہیں جو علم ہی سے بولے اور علم ہی سے سکوت اختیار کرے۔ شیطان کہتا ہے کہ اس شخص کو دیکھو کہ بولنے کی نسبت اس کا خاموش رہنا میرے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اور بعض اکابر نے ابدال (صوفیا کا ایک گروہ) کی صفت یوں بیان کی ہے کہ ان کی غذا فاقہ ہے۔ اور وہ صرف اس وقت سوتے ہیں جب نیند ان پر غلبہ پالے اور ضرورت کے بغیر بات نہیں کرتے۔ جب تک ان سے کوئی کچھ پوچھے نہیں، کلام نہیں کرتے اور جب کوئی دریافت کرتا ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ آس پاس کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کی بات کا جواب دے سکتا ہے تو پھر بھی چپ رہتے ہیں یہاں تک کہ بہت ہی مجبوری کی حالت میں لب کھولتے ہیں اور یہ لوگ سوال کے بغیر کلام میں ابتدا کرنے کو "تقریر کی خفیہ لذت" میں شمار کرتے تھے۔

---

[1] اسلامی نظام میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ (طلوع اسلام)

فتوے دینے میں احتیاط

حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ ایک شخص کے پاس سے گزرے جو لوگوں کے سامنے تقریر کر رہا تھا فرمایا کہ اس کا مقصد اپنا تعارف کرانا ہے۔ بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ عالمِ حق وہ ہے کہ جب اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو اسے یوں محسوس ہو کہ گویا اس کی داڑھ نکالی جاتی ہے اور حضرت ابن عمرؓ فتویٰ دریافت کرنے والے کو کہتے تھے کہ تم لوگ ہمیں پل بنا کر دوزخ کی طرف عبور کرنا چاہتے ہو۔ ابوحفص نیشاپوریؒ فرماتے ہیں کہ عالمِ حق وہ ہے کہ فتویٰ کا جواب دیتے وقت اس بات سے ڈرے کہ کہیں قیامت کو یہ پوچھ نہ ہو کہ کہاں سے جواب دیا تھا؟ امام ابراہیم نخعیؒ سے اگر کوئی مسئلہ پوچھتا، تو روتے اور فرماتے کہ کیا تمہیں کوئی دوسرا نہیں ملا تھا کہ مجھ پر چڑھائی کی؟۔ ابوالعالیہ الریاحیؒ، ابراہیم بن ادہمؒ، امام ابراہیم نخعیؒ اور امام سفیان ثوریؒ دو یا تین شخصوں یا معمولی جماعت کے سامنے مسائل بیان کرتے اور جب لوگ زیادہ ہو جاتے تو چلے جاتے۔

مَا اَدْرِی (میں نہیں جانتا) کا علمی مرتبہ

ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ عزیرؑ نبی ہیں یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ تبع (یمن کا قدیم بادشاہ) ملعون ہے یا نہیں اور میں نہیں جانتا کہ ذوالقرنین نبی ہیں یا نہیں۔ اور جب آپ سے کسی نے دریافت کیا کہ سب جگہوں میں بہتر کون سی ہے اور بدتر کون سی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نہیں جانتا۔ یہاں تک کہ جبریل علیہ السلام تشریف لائے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا تو انہوں نے بھی لَا اَدْرِی کہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالےٰ نے خبر دی کہ سب جگہوں میں بہتر مسجدیں ہیں اور ان میں بدترین جگہیں بازار ہیں۔ حضرت ابن عمرؓ سے اگر کوئی دس مسئلے پوچھتا تو آپ ایک کا جواب دیتے اور نو کے جواب میں خاموش رہتے اور حضرت ابن عباسؓ نو کا جواب دیتے تھے اور ایک کے جواب میں سکوت اختیار کر لیتے۔ فقہاء سلف میں سے کئی ایسے بزرگ تھے جو "ادری" کی بجائے "لا ادری" زیادہ کہتے تھے۔ ان میں امام سفیان ثوریؒ، امام مالک بن انسؒ، امام احمد بن حنبلؒ، فضیل بن عیاضؒ اور بشر بن حارثؒ شامل تھے۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کہتے ہیں کہ میں نے اس مسجد میں ایک سو بیس صحابہ رضوان اللہ علیہم دیکھے ہیں اور جب ہی ان سے کوئی فتویٰ یا حدیث پوچھی جاتی تو ان میں سے ہر ایک یہی چاہتا کہ دوسرا بھائی ہمیں اس سوال سے بچا لے۔ دوسری روایت میں یوں ہے کہ جب ان میں کسی پر کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو وہ اس کو دوسرے کے پاس بھیج دیتے اور وہ تیسرے کے پاس یہاں تک کہ پھرتے پھراتے وہ مسئلہ پھر پہلے صحابی کے پاس آ جاتا۔ ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے کہ اصحابِ صفہؓ جو بڑی تنگدستی کی زندگی بسر کرتے تھے، میں سے کسی کے بکرے کی ایک بھنی ہوئی سری بطور تحفہ آئی۔ اگرچہ اسے اس کی سخت حاجت تھی لیکن اس نے دوسرے ساتھی کو تحفہ کے طور پر پیش کر دی اور دوسرے نے تیسرے کو۔ اس طرح رفتہ رفتہ وہ پھر پہلے صحابی کے پاس پہنچ گئی۔ تو غور کیجیے کہ اس زمانے میں علماء کا معاملہ کیسے الٹا ہو گیا ہے کہ پہلے

زمانے میں علماء حق جس چیز سے بھاگتے تھے وہ اب مطلوب ہو گئی ہے اور جو مطلوب تھی اس سے نفرت کرنے لگے

فتوے کیلئے سرکاری اجازت کی ضرورت

اور فتویٰ جاری کرنے سے بچنے کی خوبی اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے کہ صرف تین شخص فتوے دے سکتے ہیں۔ ایک حاکم، دوسرا مامور، اور تیسرا متکلف۔ اور بعض اکابر فرماتے ہیں کہ صحابہ چار چیزوں سے پہلو تہی کیا کرتے تھے۔ اول امامت، دوم وصیت، سوم امانت، چہارم فتویٰ۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ کم علم شخص جلد فتویٰ دینے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اور جو زیادہ پرہیزگار ہوتا تھا وہ فتویٰ کو سب سے زیادہ دوسروں پر ڈالتا تھا۔ اور صحابہ کرام اور تابعین کا شغل پانچ چیزوں میں تھا۔ (۱) قرآن مجید کی تلاوت (۲) مساجد کی آبادی۔ (۳) ذکر الٰہی (۴) امر بالمعروف (۵) اور نہی عن المنکر۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ انسان کی تمام باتیں اس کے حق میں نقصان دہ ہیں مگر تین (۱) امر بالمعروف، (۲) نہی عن المنکر۔ (۳) اور ذکر الٰہی۔ اور ارشاد ربانی ہے۔ لَا خَيْرَ فِیْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ۔ ان کے اکثر مشوروں میں بھلائی نہیں مگر جو صدقہ یا نیکی یا لوگوں کے درمیان صلح کا حکم دے۔" کسی اہل علم نے کسی حنفی فقیہ کو خواب میں دیکھا، اور پوچھا کہ تم جو فتوے دیا کرتے تھے اور قیاس سے فیصلے کیا کرتے تھے اس کا اللہ تعالےٰ کے نزدیک کیا حال پایا؟ تو اس نے ناک چڑھائی اور منہ پھیر لیا اور کہا کہ ہم نے اسے کچھ نہ پایا۔ اور اس کا انجام ہم کو اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور ابن حصین کہتے ہیں کہ آجکل کے عالم ایسے سوال کا جواب دے دیتے ہیں کہ اگر وہ سوال حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوتا تو وہ اس کے جواب کے لئے تمام اہل بدر کو جمع کرتے۔ غرض کہ فتوے دینے میں خاموشی اختیار کرنا ہمیشہ سے علمائے حق کا دستور رہا ہے۔

خاموشی حکمت ہے

حدیث میں آیا ہے کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ اسے خاموشی اور زہد عنایت ہوا ہے۔ تو اس کے قریب ہو کیونکہ اسے حکمت تعلیم کی جاتی ہے۔ اور بعض اکابر کہتے ہیں کہ علماء دو قسم کے ہیں ایک عام عالم دین جو مفتی ہے یہ لوگ بادشاہوں کے مصاحب ہوتے ہیں اور دوسرا خاص عالم دین جو توحید اور دل کے اعمال کا عالم ہے اور یہ لوگ علیحدگی اور تنہائی پسند ہوتے ہیں اور کہا جاتا تھا کہ امام احمد بن حنبل کی مثال دریائے دجلہ کی طرح ہے کہ ہر شخص اس میں سے چلو بھر لیتا ہے۔ اور بشر بن حارث کی مثال اوپر سے ڈھکے ہوئے میٹھے کنوئیں کی طرح ہے کہ اس کا قصد فرداً فرداً کیا جا سکتا ہے۔ لوگ پہلے یوں کہتے تھے کہ فلاں شخص عالم ہے اور فلاں فلسفی، اور فلاں مقرر، اور فلاں عمل میں زیادہ ہے اور ابو سلیمان فرماتے ہیں کہ معرفت الٰہی کلام کی نسبت خاموشی سے زیادہ قریب ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ جب علم زیادہ ہوتا ہے تو باتیں کم ہو جاتی ہیں اور جب باتیں زیادہ ہوتی ہیں تو علم کم ہو جاتا ہے۔ اور حضرت سلیمان فارسی رضؓ نے حضرت ابوالدرداءؓ کو ایک خط لکھا حضور

صلے اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کے درمیان بھائی چارہ قائم کیا تھا کہ اے میرے بھائی! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ آپ طبیب بن گئے ہیں اور مریضوں کا علاج کرتے ہیں مگر سوچ لو کہ اگر تم واقعی طبیب ہو تو پھر تو بولئے کہ آپ کی کلام میں شفا ہے اور اگر تم مصنوعی طبیب بن گئے ہو تو پھر خوفِ خدا کرو۔ اور کسی مسلمان کو جان سے نہ مارو۔ اس خط کے بعد حضرت ابوالدرداءؓ سے جب کوئی دوا پوچھتا تو آپ توقف کیا کرتے اور حضرت انسؓ سے کوئی سوال کرتا تو فرماتے ہمارے آقا حضرت امام حسن علیہ السلام سے دریافت کرو۔ اسی طرح اگر کوئی حضرت ابن عباسؓ سے پوچھتا تو فرماتے کہ حارث بن زیدؓ سے دریافت کرو۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے کہ سعید بن المسیبؒ سے پوچھو۔ اور حکایت بیان کی گئی ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضرت حسن بصریؒ کی موجودگی میں بیس احادیث بیان کیں۔ کسی نے ان کی تفسیر پوچھی تو انہوں نے فرمایا کہ میں بجز روایت کے اور کچھ نہیں جانتا۔ حضرت بصریؒ نے ایک ایک حدیث کی تفسیر علیحدہ علیحدہ بیان فرمائی۔ لوگوں کو ان کی تفسیر اور یادداشت کی خوبی پر حیرت ہوئی تو صحابیؓ نے ایک مٹھی کنکروں کی اٹھا کر ان لوگوں کو ماری کہ تم مجھ سے علمی باتیں پوچھتے ہو حالانکہ سب سے بڑے عالم دین تمہارے درمیان موجود ہیں۔

[اس کے بعد مصنف نے باطن کے رموز و اسرار کے متعلق بہت کچھ تفصیل سے لکھا ہے۔ چونکہ ان امور کا تعلق علماء سے نہیں اس لئے ہم نے اس حصہ کو حذف کر دیا ہے اور سلسلہ کلام اس مقام سے آگے بڑھایا ہے جہاں سے پھر علماء سے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ طلوع اسلام]

(۰)

علمائے حق کی ایک علامت انکسار ہے

اور عالم حق کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ غمگین، انکسار کے ساتھ خاموش رہے۔ اس کی صورت و لباس اور سیرت و کردار، گفتگو اور خاموشی سب میں خوفِ الٰہی کا اثر ظاہر ہو کہ جب ہی اس کی صورت دیکھی جائے خدا یاد آئے اور اسکی صورت اس کے عمل پر دلالت کرے۔ اور علمائے حق اپنے چہرے کی فروتنی اور عاجزی سے پہچانے جاتے ہیں اور بعض اکابر کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو وقار کے ساتھ فروتنی کے لباس سے بہتر لباس نہیں پہنایا۔ کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کا لباس ہے۔ اور صالحین، صدیقوں اور علماء کی علامت ہے۔ اور زیادہ گفتگو کرنی، ہنسی مزاح میں غرق رہنا، اور حرکت اور کلام میں تیزی کرنی یہ سب علامتیں شقاوت اور اللہ تعالیٰ کے زبردست عذاب و غضب سے بے خوف اور غافل ہو جانے کی ہیں اور دنیا دار علماء کا راستہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بھولے ہوئے ہیں۔

علماء تین قسم کے ہیں

جناب سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ عالم تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف ہیں لیکن اس کے ایام (یعنی تاریخ عالم) سے نابلد ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو حرام و حلال کے فتوے دیتے ہیں۔ اس قسم کے علم سے خوفِ الٰہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسرے

وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو تو جانتے ہیں لیکن اس کے احکام و ایام اللہ کا علم نہیں رکھتے۔ یہ عامۃ المومنین ہیں اور تیسرے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بھی پہچانتے ہیں اور اس کے احکام و ایام کا بھی علم رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صدیق ہیں اور خوف اور عاجزی صرف انہی پر غالب ہوتی ہے۔ ایام اللہ سے مراد اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں اور عقوبتوں کی تفصیلات ہیں جو اگلے اور پچھلے زمانے کے لوگوں پر مرحمت ہوئیں اور وارد ہوئیں پس جس شخص کا علم ان چیزوں کو محیط ہوگا اس کا خوف اور عاجزی زیادہ ہوگی۔

علم کے لئے وقار اور حلم ضروری ہے

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرو اور علم کے لئے وقار اور علم سیکھو۔ اور جن سے سیکھتے ہو ان کی تواضع کرو۔ اور جو شخص تم سے سیکھے وہ تمہاری تواضع کرے اور جابر علماء سے نہ ہونا کہ تمہارا علم تمہاری جہالت کو کفایت نہیں کریگا اور کسی نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو علم کی دولت سے نوازتا ہے تو اسے علم کے ساتھ حلم، تواضع، خوش خلقی اور نرمی بھی عطا کرتا ہے اور اسی کا نام علم مفید ہے اور کسی بزرگ کا قول ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ علم، زہد، تواضع، اور حسن خلق کی نعمتیں عطا فرماتے تو وہ متقیوں کا امام ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ میری امت کے نیک لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں کہ ظاہراً تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی وسعت کی وجہ سے ہنستے ہیں لیکن خفیہ اس کے عذاب کے خوف سے روتے ہیں۔ ان کے بدن زمین میں ہیں اور دل آسمان میں۔ ان کی روحیں دنیا میں ہیں اور ان کی عقلیں عقبیٰ میں وقار کے ساتھ چلتی ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ حلم علم کا وزیر، نرمی اس کا باپ اور تواضع اس کا لباس ہے اور بشر بن حارثؒ کہتے ہیں کہ جو شخص علم سے ریاست کا طالب ہوا تو اللہ تعالیٰ اسے اپنے قریب کرنا پسند نہیں فرماتے کیونکہ وہ زمین و آسمان میں مبغوض ہے۔ اور بنی اسرائیل کی حکایات میں مروی ہے کہ حکیم نے حکمت میں تین سو ساٹھ کتابیں تصنیف کیں۔ یہاں تک کہ وہ دانا شخص مشہور ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی بھیجی کہ اس حکیم نے زمین کو نفاق سے بھر دیا۔ اور اس میں کسی چیز سے اس نے میری قربت کی نیت نہیں کی اور میں اس کے نفاق سے کچھ قبول نہیں کرتا۔ جب اس دانا شخص کو اس کی خبر ہوئی تو وہ سخت شرمندہ ہوا۔ اور اسے چھوڑ کر عوام میں شامل ہو گیا۔ بازاروں میں گھوما اور بنی اسرائیل کے ساتھ کھانا پینا شروع کیا اور عاجزی اختیار کی پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی پر وحی فرمائی کہ اس سے کہہ دو کہ اب تجھے میری رضامندی کی توفیق حاصل ہوئی۔

علمائے دین اور پولیس کا سپاہی

اور امام اوزاعیؒ بلال بن سعدؓ سے حکایت بیان کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہے۔ لیکن علمائے دنیا کی طرف دیکھتا ہے جو لوگوں کے سامنے،

تصنع اور بناوٹ سے کام لیتا ہے، اور سرکاری عہدوں کے حصول کے شوقین ہیں، تو ان کو برا نہیں سمجھتا۔ حالانکہ وہ اس سپاہی کی نسبت زیادہ قابلِ نفرت ہیں۔ اور مروی ہے کہ کسی نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے افضل عمل کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا۔ حرام چیزوں سے اجتناب کرنا اور ہمیشہ اللہ تعالےٰ کی یاد میں رطب اللسان رہنا۔ پھر کسی نے پوچھا۔ کون سے ساتھی اچھے ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ ساتھی کہ جب تک اللہ تعالےٰ کا ذکر کرو تو وہ تمہاری مدد کرے۔ اور اگر تم یاد الٰہی سے غافل ہو تو وہ تمہیں یاد دلائے۔ پھر پوچھا گیا کہ کون سے ساتھی بُرے ہیں۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ اگر تم یادِ الٰہی سے غافل ہو جاؤ تو وہ تمہیں یاد نہ دلائے، اور اگر تم یاد الٰہی میں مشغول ہو تو وہ تمہاری مدد نہ کرے۔ پھر آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے۔ آپؐ نے فرمایا۔ جو سب سے زیادہ اللہ تعالےٰ سے خوف رکھتا ہو۔ عرض کیا گیا کہ ہم سے جو بہتر لوگ ہوں ان کے متعلق ہمیں ارشاد فرمادیں تاکہ ہم ان کی مجلسوں میں بیٹھا کریں۔ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایسے لوگ ہیں کہ جب ان پر نظر پڑے تو اللہ تعالےٰ کی یاد آوے۔

مفسد علماء شرالناس ہیں

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب لوگوں میں سے بُرے انسان کون سے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا۔ کہ اے اللہ میں آپ کی بخشش چاہتا ہوں، صحابہؓ نے اصرار کیا کہ ہمیں ان کی بابت ضرور مطلع فرمادیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ علمائے دین ہیں کہ جب وہ مفسد بن جائیں تو تمام لوگوں سے بُرے ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن سب لوگوں سے زیادہ ماتم وہ شخص ہوگا جو دنیا میں زیادہ فکر کرتا تھا۔ اور آخرت میں سب سے زیادہ وہ ہنسے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ رویا ہوگا۔ اور سب سے زیادہ خوش وہ ہوگا جو دنیا میں لمبا عرصہ غمگین رہا ہوگا۔

دنیادار عالم کس طرح مفتی بنتا ہے

حضرت علیؓ نے اپنے ایک خطبہ میں یہ اعلان فرمایا کہ میرا ذمہ ہے اور میں اس کا ضامن ہوں کہ جس قوم میں تقویٰ ہے اس کی زراعت تباہ نہ ہوگی۔ اور ہدایت کے ہوتے ہوئے ان کی جڑ کے خشک ہونے کا خطرہ نہیں اور لوگوں میں جاہل تر وہ شخص ہے جسے خوفِ خدا کی قدر نہ ہو۔ اور اللہ تعالےٰ کے نزدیک سب سے بُری وہ مخلوق ہے جو ہر جگہ سے علم جمع کر کے فتنہ کی تاریکیوں میں اپنا مقام تلاش کرے۔ ایسے ویسے ذلیل لوگ اسی بُری مخلوق کا نام عالم دین رکھ دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ علم میں ایک دن بھی سلامتی سے نہ رہا۔ صبح اٹھتے ہی وہ چیز (یعنی دنیا کا ساز و سامان) بڑی مقدار میں حاصل کرتا ہے کہ جس کی صرف تھوڑی مقدار ہی لینا اچھا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ سڑے پانی سے سیراب ہو جاتا ہے اور اکثر بے فائدہ باتیں کرتا ہے تو لوگوں کے واسطے مفتی بن بیٹھتا ہے۔ تاکہ لوگوں کو جن امور میں شبہ ہے انہیں خلاصی کی راہ بتائے۔ اور جب اس کے سامنے کوئی اہم مسئلہ پیش ہوتا

ہے۔ تو اس کے لئے اپنی رائے سے ایک لغو قیاس بنا لیتا ہے۔ تو وہ شخص شبہات کو کاٹنے میں مکڑی کے جالے کی مانند ہے۔ یہ نہیں جانتا کہ ٹھیک فیصلہ کیا یا غلط۔ وہ بہت سی جہالتوں کا مرتکب اور بے سمجھے بوجھے اٹکلیں دوڑاتا ہے جس مسئلے سے لاعلم ہے اس کے بارے اپنی لاعلمی کا عذر نہیں کرتا کہ بچ جائے اور نہ ہی علم کو دانتوں سے مضبوطی سے پکڑتا ہے کہ غنیمت حاصل کرے۔ خونِ ناحق اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اور اس کے فتووں سے زناکاری حلال ہو جاتی ہے۔ جو مسئلہ بھی اسے درپیش ہو اسے اسکے جواب کی قدرت حاصل نہیں اور وہ کسی معاملے کے سونپے جانے کے قابل نہیں۔ ایسے ہی مفتی سخت عذاب کے مستحق ہیں اور ساری عمر رونے کے لائق۔

یہ بھی حضرت علیؓ کا قول ہے کہ جب تم علم کو سنو تو خاموش ہو جاؤ اور اسے فضول باتوں کے ساتھ شامل نہ کرو۔ ورنہ دل میں اس کی تاثیر نہ ہوگی۔ اور بعض سلف صالحین کا قول ہے کہ عالمِ دین جب ایک دفعہ ہنستا ہے تو اس کے منہ سے علم کا ایک حصہ خارج ہو جاتا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ اگر استاد میں تین باتیں ہوں، تو ان کے سبب سے شاگرد پر پوری نعمت ہوگی۔ اول صبر، دوم تواضع اور سوم خوش خلقی۔ اور جب شاگرد میں تین صفات ہوں تو استاد پر نعمت کامل ہوتی ہے۔ ایک عقل، دوسرے ادب، تیسرے حسنِ فہم۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید میں جن اخلاقِ فاضلہ کا ذکر ہے علمائے حق میں وہ پائے جاتے ہیں۔ وہ لوگ قرآن مجید کو صرف پڑھنے پڑھانے کے لئے نہیں سیکھتے۔ بلکہ اس پر عمل کرتے ہیں۔

علمی تکبر

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم نے ساری عمر اس حقیقت کا مشاہدہ کیا کہ صحابہ کرامؓ کو قرآن مجید سے پہلے ایمان کی نعمت ملتی تھی۔ اور جب سورۃ نازل ہوتی تھی تو ہم اس کے حلال حرام اور اوامر و نواہی کو معلوم کر لیتے تھے اور جس مقام پر شک پڑتا تھا تو اسے معلوم کر لیتے تھے اور اب میں ایسے لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ انہیں ایمان سے پہلے قرآن ملتا ہے۔ وہ سارا قرآن مجید پڑھ جاتے ہیں لیکن اس کے اوامر و نواہی کا علم حاصل نہیں کر پاتے۔ بلکہ وہ تو یہ تک بھی نہیں جانتے کہ اسے سمجھ کر پڑھنا چاہیئے۔ اور ایک اور روایت میں اسی مفہوم کا مضمون ہے کہ ہم اصحاب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید سے پیشتر ایمان نصیب ہوا تھا۔ اور عنقریب تمہارے بعد کچھ ایسے لوگ آ دیں گے کہ ان کو ایمان سے پہلے قرآن ملے گا کہ وہ اس کے الفاظ و حروف تو درست کریں گے اور اس کے حقوق اور حدود یعنی احکامات کو ضائع کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ ہم نے قرآن مجید پڑھا ہے ہم سے زیادہ پڑھنے والا کون ہے۔ اور ہم نے اس کا علم حاصل کر لیا ہے۔ ہم سے زیادہ علم حاصل کرنے والا کون ہے۔ یہ ہے قرآن مجید میں ان کا حصہ۔ اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ یہ امت کے برے لوگ ہیں۔

(باقی)

خورشید عالم

انقلابی عربوں کا عالمی کردار

اکتوبر ۱۹۶۹ء کے "طلوعِ اسلام" میں عربوں کے عالمی کردار کا ایک حد تک جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اس میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح عربوں کو غلط رنگ میں پیش کیا جاتا رہا، اور پیش کیا جا رہا ہے۔ ذرا غور سے دیکھا جائے تو صاف نظر آ جائے گا کہ یہ کچھ عربوں ہی کا مقدر نہیں بلکہ انسان کے معاشرتی ارتقاء میں ایسے ہی ہوتا چلا آیا ہے جب کبھی اور جہاں کہیں داعیانِ انقلاب ابھرے انہیں طرح طرح کے ناموں سے موسوم کرنے اور ان کی دعوتِ انقلاب کو ناکام بنانے کی سعی لاحاصل کی جاتی رہی۔ انسان کا مسئلہ شروع سے یہی رہا ہے کہ طرزِ معاشرت میں ایسی تبدیلیاں لائی جائیں جن سے افراد معاشرہ کی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے مواقع زیادہ سے زیادہ ہوں۔ اور افراد یا مجموعۂ افراد کی فلاح و بہبود کے مقابلے میں اجتماعی بہبود کو فروغ حاصل ہو۔ قرآن نے اس کشمکش کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ ہر پیغمبر کے ضمن میں قرآن نے بتایا ہے کہ دو گروہ اس کی دعوتِ انقلاب کے شدید مخالف رہے ہیں۔ ایک گروہ سردارانِ قوم کا ہوتا تھا اور دوسرا مذہبی پیشواؤں کا۔ دونوں کے مفاداتِ خصوصی کا تقاضا یہی ہوتا تھا کہ جو ہوتا چلا آ رہا ہے وہی ہوتا چلا جائے تاکہ ان کی اجارہ داریاں قائم رہیں اور زیردست ان کے ہم پلّہ ہو جانا تو بڑی بات ہے، ان کے ہم پلّہ ہونے کا سوچ بھی نہ سکیں۔ سردارانِ قوم اور پیشوایانِ مذہب نے ہمیشہ ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور انقلاب کو روکنے کے لئے اپنی تمام تر قوت صرف کی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ داعیانِ انقلاب کو غلط رنگ میں پیش کر کے دکھایا ہے تاکہ جن مظلومین معاشرہ کی سربلندی کے وہ داعی ہیں وہ انہیں اپنا بدخواہ سمجھ کر ان کی دعوت پر لبیک نہ کہہ سکیں۔

عربوں کے خلاف یہی کچھ ہوا اور ہو رہا ہے ــــ اور عالمی سطح پر چونکہ معاشرتی قوتیں محدود نہیں رہیں، عالمگیر ہو گئی ہیں، اس لئے سردارانِ قوم اور پیشوایانِ مذہب بھی عالمی سطح پر مخالفت اور تلبیسِ حق و باطل میں لگے ہوئے ہیں۔ اب سردارانِ قوم سردارانِ عرب بھی ہیں اور سردارانِ استعمار بھی۔ لہذا پیشوایانِ مذہب دونوں کے دست نگر، آلۂ کار اور نقیب ہیں۔۔ وہ کبھی کبھی مقدس جھوٹ بول کر سردارانِ قوم کی حرف گیری بھی کر دیتے ہیں تاکہ عوام الناس کو اس دھوکے میں مبتلا کر رکھ سکیں

کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں فی سبیل اللہ کر رہے ہیں لیکن وہ بالعموم کرتے یہ ہیں کہ اپنے سرداروں کے تمام تر کارہائے سیاہ کو قوم کے نامۂ اعمال میں ڈال دیں اور ان کی روسیاہی کا سامان بہم پہنچا دیں۔ موجودہ صدی میں عربی سیاست کو دیکھا جائے تو وہ چند سرداروں کی سیاست دکھائی دے گی اور بس۔ یہ سردار استعمار کے آلۂ کار تھے اور اپنی مفاد پرستی کے لئے عربوں کو استعمال کرتے تھے عرب استعمار کے غلام تھے۔ جب ادوارِ استعمار نے انہیں توڑا تو خود ہی آزادی دے دی اور ان کی آزاد سلطنتیں بھی قائم کیں۔ لیکن عربوں کا معاملہ بندگی میں ہوا تھا آزادی میں بھی وہی رہا۔ تیرہ برس میں بہت رنگ بدلے لیکن عرب دنیا جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ عربوں کا کردار سردارانِ عرب کا کردار سمجھا اور سمجھایا جانے لگا۔ استحصال پسندی پر سردار عرب معاشرے کا غیر صالح طبقہ رہے ہیں لیکن انہوں نے ہمیشہ معاشرتی اقدار کو اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے استعمال کیا ہے اور اپنے مفاد کو معاشرے کا مفاد جتایا ہے۔ عالمی استعمار کے دور میں ان کا کردار اور گھناؤنا ہو گیا ہے۔ اب وہ کچھ نہیں وہ استعمار کے کارندے ہیں اور ان سے وفاداری استعمار سے وفاداری کے مترادف ہے۔ ان سرداروں کی کوشش یہی رہی اور اب تک ہے کہ ان کے سنگھاسن نہ ڈولیں۔ اور یہ ایسا بالادست طبقہ بنے رہیں جنہیں زیرِ دست اپنے مفاد کا محافظ سمجھیں۔

ایک عرصہ استعمار کے ان شوریدوں کو عوام اپنے محسن سمجھتے رہے۔ وہ اس دھوکے میں مبتلا تھے کہ ۱۹۴۸ء کی قیامت آئی اور استعماری سازش سے فلسطین کا ایک حصہ "اسرائیل" بن گیا۔ اس نے عالمِ عرب کو ہی نہیں عالمِ اسلامی کو بھی ہلا کے رکھ دیا۔ مسلمانانِ عالم کے لئے یہ تاریخی ابتلا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اقبال نے ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کرتے کرتے جس آفتابِ تازہ کے پیدا ہونے کی نوید سنائی تھی وہ اُبھرتے اُبھرتے ڈوب گیا ہے اور اب مسلمان کی رات تو کیا ہو گی وہ مہتاب تک سے محروم رہے گی۔ یہ نتیجہ تھا سردارانِ عرب کے کردار کا۔ ان کے کردار کا یہ پہلو نہایت شرمناک اور اذیت بخش ہے کہ انہوں نے اسرائیل کا راستہ روکنے کے لئے محاذ کھولا تو گو وہ بظاہر اس دشمن کے خلاف لڑ رہے تھے لیکن دراصل وہ آپس میں ایک دوسرے کے خلاف لڑتے رہے تاکہ ایک تو استعمار کی سازش ناکام نہ ہو جائے اور دوسرے اس کی میزان میں ان کی قیمت بڑھ جائے۔ اس سے عربوں اور عام مسلمانوں میں افسردگی اور شکست کے احساسات کا ہمہ گیر ہونا قابلِ فہم تھا۔ ان احساسات کو مذہبی پیشواؤں نے خوب خوب ابھارا۔ وہ ناصحِ مشفق و مقدس بن کر آئے اور ثابت کر دکھلانے لگے کہ یہ نہ استعمار کی کارستانی ہے اور نہ استعمار کے نمک خوار سرداروں کی بلکہ یہ سزا ہے ان اعمالِ بد کی جن کے عرب مرتکب چلے آ رہے ہیں۔ یوں عیاری سے نمک خوارانِ استعمار اور اپنے مربیوں کے اعمالِ بد کی ذمہ داری عام عربوں پر ڈال دی گئی اور عربوں اور مسلمانانِ عالم کے دلوں میں یہ بات بٹھائی جانے لگی کہ قصور ان کا ہے کسی اور کا نہیں اور انہیں جو سزا دی گئی ہے وہ اس کے مستحق ہیں۔

تقاریر میں وعظ کے یہ مرجھائے ہوئے پھول رکھ کر پیشوایانِ مذہب سمجھتے تھے کہ وہ اپنے مربی سرداروں کے

پشت پناہ استعمار کو بری الذمہ قرار دینے میں کامیاب ہو جائیں گے اور اپنی مقدس قیادت کے زور سے عربوں کو استعمار کی اسیری گوارا کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ بظاہر ایسے ہی ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ ۱۹۵۶ء کی اسرائیلی جارحیت نے اسے اور تقویت دی۔ جون ۱۹۶۷ء میں تو یقین سا کر لیا گیا کہ طوفانِ اسرائیل میں عربی سفینہ ڈوب ہی گیا ہے۔ یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ ایک لہر اٹھی اور وہ عربوں کے لئے سفینہ بن گئی۔ عربوں کی شکست کا چرچا کرنے والوں غیروں اور اپنوں کے سامنے یہ حقیقت منتظر کوئی بیس سال کے بعد اباس مجاز میں آئی جسے اقبالؒ نے اپنے انداز سے یوں پیش کیا ہے۔

گہے باشد کہ کارِ ناخدائی می کند طوفاں
کہ از طغیانِ موجے کشتیم بر ساحل افتاد است

یہ موجِ بے باک جو عربوں کے لئے سفینہ بن گئی اور جس نے عربوں کے کردار کو دھو کے پاک کرنے کے سامان پیدا کر دیئے مجاہدینِ فلسطین تھے جو ۱۹۴۸ء میں لاکھوں کی تعداد میں بے گھر ہوئے۔ ان کا کوئی پرسانِ حال نہ ہوا۔ انہیں نہ گھر میسر آسکا نہ وطن۔ مہاجر کیمپ ان کی ساری دنیا تھی۔ ان کیمپوں میں جوان بوڑھے ہوتے اور بوڑھے سسک کر مرے۔ بے سرو سامانی میں نئی نسل ابھری۔ ۱۹۴۸ء اور اس سے کچھ پہلے اور بعد میں پیدا ہونے والے جوان ہوئے تو وہ بجلی کا کڑکا بن گئے۔ اس کڑکے سے استعمار، اس کا اڈہ اسرائیل اور اس کے نمک خوار سردارانِ عرب اور پیشوایانِ مذہب لرز اٹھے ہیں۔ اب عربوں کا کردار ان فدائیانِ مجاہدین کا کردار ہے اور یہ کردار ان تک ہی محدود نہیں رہا عام عربوں میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس کردار کو صحیح پس منظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ پس منظر کم و بیش یہ ہے۔

صیہونیت سامراج کا خود کاشتہ پودا تھی ہے اور سامراج ہی اس کی آبیاری بھی کرتا چلا آیا ہے۔ یہ تفصیل ان صفحات میں آچکی ہے کہ کس طرح امریکہ نے اقوامِ متحدہ کی وساطت سے بھی اور اس کے بغیر بھی پہلے فلسطین کو تقسیم کرا کے اسرائیل کا قیام ممکن بنایا پھر اس کی حدود میں توسیع کے سامان مہیا کئے۔ تا آنکہ آج اسرائیل دریائے اردن کے مغربی حصے شام کے جنوبی حصے اور پورے سینائی کے علاقے پر قابض ہو گیا ہے اور اردن، شام، لبنان اور متحدہ جمہوریہ عربیہ کے اندرونی علاقوں پر اس کے حملے روزمرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ یہ سنگین صورتِ حال ہے۔ وسیع عرب علاقوں کا اسرائیل کے قبضے میں آجانا اور وسیع تر عرب علاقوں کا اسرائیل ایسے دشمن کے حملوں کی زد میں آنا بجائے خود سنگین ہے۔ لیکن یہ صورت کہیں زیادہ سنگین اس لئے ہے کہ یہ اسی طرح رہ نہیں سکتی۔ یہ تعطل ایک خوفناک دھماکے سے ٹوٹے گا۔ اس دھماکے کی زد میں عالمِ عرب تو ہوگا ہی، یہ دھماکہ عالمگیر بھی ہو سکتا ہے۔ امریکہ کی مضطربانہ اور مجنونانہ کوشش یہ ہے کہ یہ دھماکہ نہ ہو۔ اس کا خیال ہے کہ دھماکہ ٹلتا جائے تو سامراج اور صیہونیت تو غصب شدہ علاقوں کو اپنے تصرف میں رکھ کر اس کے تیل کے ذخائر سے متمتع ہوتے رہیں گے لیکن عرب ایسے پریشان حال رہیں گے کہ وہ اپنے وسائل کو مجتمع کرنے سے قاصر رہیں گے اور ان کے حریف نہیں ہو سکیں گے۔ عربوں کو پریشان حال بنائے رکھنے کے لئے عربوں کے خلاف پراپیگنڈہ کرایا گیا اور اب تک کرایا

جا رہا ہے کہ انہوں نے نسل پرستی اختیار کر لی ہے۔ وہ بے حیائی اور بد اخلاقی میں لگ گئے ہیں۔ وہ اپنے معاشرتی مصائب کا حل سوشلزم میں دیکھنے لگے ہیں لہٰذا وہ اسلام سے وابستہ نہیں رہے اور کفر کے دائرے میں شریک ہو گئے ہیں۔ یہ چرچا اس لئے کیا جا رہا ہے کہ قیادت کا جو دھارا پھوٹ بہا ہے وہ خشک ہو جائے اور سیاسی اور مذہبی اجارہ داریاں استعمار کے سلسلے میں پہلتی اور پھولتی رہیں۔ ایسی دلیلیں دینے میں وہ نام نہاد اسلامی حلقے پیش پیش ہیں جو فلسطین اور بیت المقدس کے مسئلے کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس کے حل کے لئے مسلمان ممالک کی مشترکہ (مگر کاغذی) کارروائی پر زور دیتے نہیں تھکتے۔ اگر یہ سامراجی دلیل تسلیم کر لی جائے تو صیہونی جارحیت کے شکار عرب ممالک مسلمانانِ عالم کی ہمدردی اور حمایت کے مستحق نہیں رہتے۔ ظاہر ہے کہ مقابلہ یہود (اہل کتاب) اور عرب (کفار) میں ہو تو ہمدردی اہل کتاب سے ہوگی نہ کہ کفار سے۔ فلسطین کو اسلامی مسئلہ قرار دینا، عربوں کو کافر ٹھہرانا اور مسلمان ممالک کو مسجد اقصیٰ کی بازیابی کے لئے ایک مرکز پر لانے کی خواہش کرنا ایسے تضادات ہیں جو سامراجی منطق میں ہی روا رکھے جا سکتے ہیں۔ ضمنی طور پر حالیہ جدہ کانفرنس کی قلعی کھولنے کے لئے یہی کافی ہے کہ یہ ایسے ملک میں منعقد ہوئی جس کا کردار بین العربی اور بین الاقوامی میدانوں میں قابلِ رشک نہیں اور جو سیکرٹیریٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اس کا سیکرٹری جنرل اس ملیشیا کا نمائندہ ہوگا جس نے جنگ ستمبر کے معرکۂ حق و باطل اور مسئلہ موت و حیات میں بڑی ڈھٹائی سے پاکستان کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا اور الٹا اس نے پاکستان کے قیام تک کو محل نظر ٹھہرایا تھا۔

ایک طرف تو امریکہ یوں عربوں کی تضحیک اور تکفیر کے سامان کر رہا ہے اور دوسری طرف وہ سر توڑ کوشش کر رہا ہے کہ نہ تو اسرائیل مقبوضہ عرب علاقے خالی کرے اور نہ وہ جنگی نقطۂ نگاہ سے اتنا کمزور ہو جائے کہ غصب شدہ علاقوں کو اپنے تسلط میں رکھنے کے قابل نہ رہے۔ اسرائیل امریکہ ہی کی چھاؤنی ہے۔ اس اعتبار سے بھی کہ وہ بساطِ استعمار کا ایک مہرہ ہے اور اس اعتبار سے بھی کہ وہ جو کچھ ہے امریکہ کے دم سے ہے۔ رقبے کے لحاظ سے اسے چھوٹا امریکہ کہا جا سکتا ہے اور عزائم کے لحاظ سے پورا امریکہ۔ اسرائیل امریکہ ہی کی کمان کا تیر ہے۔ فوجی، معاشی اور مالی طور پر اسرائیل کا تنور شکم خوب خوب بھرا جاتا رہا اور بھرا جا رہا ہے۔ گو ان دنوں امریکہ یہ تاثر دینے کی سعی بیہودہ کر رہا ہے کہ وہ اسرائیل کو فوجی امداد نہیں دے رہا ہے یا اس میں احتیاط سے کام لے رہا ہے تاہم وہ اسے اعلانیہ مالی امداد دے رہا ہے۔ امریکہ کے افسانوی طور پر امیر یہودی دل کھول کر علیحدہ امداد دے رہے ہیں۔ امریکہ کی شہ نہ ہو تو یہ سوتے آج خشک ہو جائیں، اور اسرائیل اپنی موت آپ مر جائے۔ یہ تو اسرائیل کو اپنے بلکہ امریکی پاؤں پر کھڑا کرنے کی ایک صورت ہے۔ سفارتی طور پر امریکہ بڑی جانفشانی سے اسرائیل کی پشت پناہی کرتا چلا آ رہا ہے۔ اسرائیل نے جس دیدہ دلیری سے عرب علاقے ہتھیائے تھے اس کا تقاضا تھا کہ فوری طور پر اسے روک کر پسپا ہونے پر مجبور کیا جاتا۔ امریکہ نے ایسا نہیں ہونے دیا اور فوری اور مؤثر کارروائی نہیں ہونے دی۔ اس نے ابتدا ہی سے یہ توقف اختیار کیا کہ عربوں اور اسرائیل کو

باہمی مذاکرات سے تصفیہ کرنا چاہیئے۔ اپنی امن پسندی اور معقول روش کا رعب جمانے کے لئے اس نے اقوام متحدہ میں یہ قرارداد منظور ہو جانے دی کہ اسرائیل مقبوضہ علاقے خالی کر دے لیکن وہ اس ادھیڑبن میں رہا اور ہے کہ عرب، اسرائیل سے براہِ راست بات کریں۔ وہ یوں ایک تو اسرائیل کو عربوں سے تسلیم کرانا چاہتا ہے دوسرے وہی ڈھونگ رچانا چاہتا ہے جو کشمیر میں رچایا گیا۔ یہ ناجائز طور پر تقسیم کیا ہوا علاقہ اکیس سال سے امریکہ (اور اقوام متحدہ) کی امن پسندی اور امن خواہی کا ماتم کر رہا ہے۔ امریکہ ایک حد تک یہی صورت عربوں کے لئے پیدا کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حالات امریکہ کے بس میں نہیں اور یہ کامیابی اتنی وقیع ثابت نہیں ہو رہی جتنی امریکہ کو توقع تھی۔

یہ دیکھ کر کہ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی قومیں عربوں کی موید ہیں اور اسرائیلی انخلاء کے لئے مصر ہیں امریکہ نے ایک اور ڈھونگ رچایا اور یہ تصفیہ چار بڑوں کے سپرد کر دیا۔ امریکہ، روس، فرانس اور برطانیہ جیسے بڑے نہ منصفانہ فیصلہ کر سکتے ہیں اور نہ ان کا فیصلہ عربوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔ فیصلہ کرنا ان بڑوں کا مقصود بھی نہیں۔ وہ اس بہانے اپنی اپنی مطلب براری کرنا چاہتے ہیں۔ دنیا کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکنے کے علاوہ کہ قضیے کا پُرامن حل تلاش کیا جا رہا ہے امریکہ اس قضیے کو چار سے کہیں زیادہ دو تک محدود کر لینا چاہتا ہے۔ وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا ہے کہ روس عربوں کی حمایت میں اس حد تک آگے نہ نکل جائے کہ امریکہ سے براہِ راست تصادم تک نوبت پہنچ جائے۔ روس کے متعلق یہ اطمینان کر کے امریکہ دل جمعی سے اس قضیے کو ٹالے جا سکتا ہے۔ اس مہلت کا اسرائیل کو یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ وہ عربوں کو ڈرا دھمکا کر اور ان پر حملے کر کے انہیں براہِ راست مذاکرات پر مجبور کر دے۔ عرب اس فریب میں کیا آتے وہ تو الٹا اور لیے قابو ہوتے جا رہے ہیں، البتہ روس کی طرف سے امریکہ کو خاصا اطمینان حاصل ہو گیا ہے۔ روس نے عربوں کا بہت دم بھرا لیکن اس کا بہت جلدی پتہ چل گیا کہ وہ ایک حد تک سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں۔ روس کے رویئے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عربوں کو شکست سے بچانے کا کوئی خاص خواہشمند نہیں تھا۔ وہ انہیں صرف یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ ان کے ساتھ ہے اور ان کی ممکن مدد کرے گا۔ وہ یوں عربوں کا اعتماد حاصل کر کے بحر روم اور عالم عرب میں اپنا وہ مقام حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے وہ زمانوں کے زمانے سے خواب دیکھتا چلا آیا ہے۔ یہ کامیابی روس نے واقعی حاصل کی۔ اس کامیابی سے البتہ عربوں کا نہ بھلا ہو سکتا تھا نہ ہوا۔

فلسطین میں فلسطین سے جو کچھ کیا گیا اس پر نگہ بازگشت ڈالی جائے تو یوں لگے گا جیسے ایک شطرنج کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کھیلنے والے ہیں امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس، اقوام متحدہ وغیرہ۔ عرب ممالک کے سربراہ یعنی شیوخ اور سلاطین میں سے بعض کبھی کبھی یہ کھیل کھیلنے لگ جاتے تھے ورنہ بالعموم وہ مہروں کا کام دیتے رہے اور کھلاڑیوں کے ہاتھوں آپس میں ہی ایک دوسرے کی مات دیتے میں لگے رہے۔ کسی نے نہیں دیکھا نہ سوچا کہ بساط کس کے

سینے پر بھی ہے۔ اور گو اس کی مشکیں کس کے اسے اس حد تک بے جان بنا دیا گیا ہے کہ اس سے بے پروا ہو کر کھیل کھیلا اور جاری رکھا جا رہا ہے لیکن اس تنِ بے جان میں جانِ رفتہ آ سکتی ہے اور جب آئے گی تو اس بساط کو تہ و بالا کر کے رکھ دے گی۔ یہ بساطِ فلسطین کے کھلاڑی بھول رہے ہیں کہ انہی کی بساط ویٹ نام میں الٹی جا چکی ہے اور اس اہتمام سے کہ پھر سے ویٹ نام میں بچھائی جا سکے گی نہ اس نئی زمین پر کہیں اور۔ فلسطین کے ایک حصے پر اسرائیلی غاصب کو برطانوی سامراج کی مدد اور امریکی سامراج کی تائید سے مسلط کیا گیا تو لاکھوں فلسطینی بے گھر ہو گئے۔ انسانوں کے اس سیلاب کو مہاجر کیمپوں میں محدود کرنے کی عیارانہ اور ظالمانہ کوشش کی گئی۔ ان بے در و دیوار گھروں میں ان انسانوں کو سامراجیوں، سامراج کے گماشتوں اور قدرت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ حالات کے اس بے رحم گرداب میں ان کا حوصلہ، ان کا عزم، ان کا احساسِ آبرو غرق ہو جانا چاہیئے تھا۔ یہ بے خانماں، مفلوک الحال، ... بچے، جوان، بوڑھے، عورتیں، مرد، ڈوبے ... اور ڈوبتے ہی گئے۔ جب یقین ہونے لگا کہ غرقِ گرداب ہو چکے ہیں تو بھنور کی گرہ کھلتی دکھائی دی۔ گرہ کھلتی گئی، کھلتی گئی ... تا آنکہ ایسی موجِ تند و جولاں ابھر آئی جس کی زد سے کسی نہنگ کا نشیمن محفوظ نہیں رہا۔ مہاجر کیمپوں میں حالات کے شکار مردہ ایک ایک دو دو کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "کیف تحی الموتیٰ" کی صراحتِ ازلی کے منکر گمان بھی نہ کر سکے کہ کیا قیامت برپا ہونے لگی ہے۔ دیکھتے دیکھتے ایک ایک دو اٹھنے والے فوج در فوج ہو گئے۔ عربوں کی سلطنتیں کانپنے لگیں۔ اسرائیل پاگل ہونے لگا۔ سامراج نے امن کی دہائی دی۔ مجاہدین کی مذمت کی جانے لگی۔ ان کے راستے روکے جانے لگے۔ ان کے کئے کی سزا لبنان، اردن اور مصر کو دی جانے لگی تاکہ یہ ممالک مجاہدین سے براہِ راست متصادم ہوں اور جو کھیل بگڑ چکا تھا اُسے پھر سے شروع کیا جا سکے۔

امریکہ نے یہ موقف اختیار کیا کہ اگر خود سر گوریلے باز نہ آئے تو اسرائیل کو لگام دینا مشکل ہو گا۔ اور جیسے اس نے جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو شکست دے کر ان کے وسیع علاقے ہتھیا لئے تھے وہ پھر سے بھرپور حملہ کر کے مزید علاقے ہتھیانے پر مجبور ہو گا تاکہ مجاہدین کی جد و جہد کو ختم کیا جا سکے اور علاقے میں امن قائم کیا جا سکے۔ روس نے بھی عافیت اسی میں دیکھی کہ مجاہدین کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے۔ ان کی بجائے حکومتوں کی مدد کی جائے اور انہیں در پردہ مجبور کیا جائے کہ مجاہدین کی حوصلہ شکنی کریں اور اقوامِ متحدہ کی نامنصفانہ اور عیارانہ "مصالحانہ" تجاویز کو قبول کر کے انہیں عملی جامہ پہنائیں۔ عرب حکمران بھی یہ کہنے لگے تھے کہ اگر اسرائیل جون ۱۹۶۷ء کے مقبوضہ علاقے خالی کر دے تو اس کے ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۶ء کے جارحانہ غصب کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنے کی توفیق مجاہدین کو ہوتی ... اور مجاہدین ہی کو ہو سکتی تھی ... کہ اسرائیل سامراج کا اڈہ ہے۔ اسے ختم ہونا چاہیئے اور پورے فلسطین کو آزاد ہونا چاہیئے۔ یہ تھی تو درماندہ راہرو کی صدائے دردناک لیکن یہ آوازِ رحیلِ کارواں بن گئی۔ اس کی زد تنہا اسرائیل پر ہی نہیں تھی جس کا استیصال مقصود تھا۔ اس کی زد امریکہ پر بھی تھی جس کے سامراجی ہاتھوں نے اسرائیل کی کیل سینۂ عرب میں پیوست کر رکھی تھی۔ اس کی زد روس پر بھی

تھی جو عربوں کی دوستی کا دم بھر کے اور انہیں عسکری اور معاشی مدد دے کر زاروں کی حسرت دیرینہ کی تکمیل کرتے ہوئے عالم عرب میں اپنے استحکام میں منہمک تھا۔ اس کی زد ان عرب حکمرانوں پر بھی تھی جو فلسطین کے ''اجڑنے'' کے بعد ٹکڑوں سے اپنی حدود سلطنت میں اضافہ کر کے مگن ہو بیٹھے تھے کہ بڑی طاقتیں اقوام متحدہ کے ذریعے یا اس کے بغیر اسرائیل سے کبھی کچھ تصفیہ کرا ہی دیں گی۔

مجاہدین کے خروج سے مسئلہ فلسطین میں کچھ تبدیلی آئی اور اس کی عنان ان ہاتھوں میں آئی جو اس بھولے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانا بھی چاہتے ہیں اور لے جا بھی سکتے ہیں۔ پہلی بار فدایان فلسطین نے اپنے عمل سے یہ جتایا کہ وہ اپنے دشمن کو پہچان گئے ہیں اور دشمن ملک کے اندر ہو تو اور ملک کے باہر ہو تو دشمن ہے۔ سام حضرت نوحؑ کا بیٹا ہو کے بھی بیٹا نہیں رہتا۔ بوجہل و بولہب حسب نسب میں اپنے لیکن معاشرتی جدوجہد میں دشمن ہیں۔ مجاہدین کی جدوجہد کی زد اندر اور باہر دور دور تک پڑتی ہے۔ اسی لئے ان کے استخفاف کی کوشش اندر سے بھی ہوئی اور باہر سے بھی۔ اس جہاد کو سمجھا تو عوامی جمہوریہ چین نے سمجھا جس کے پاس اپنی ولولہ انگیز جدوجہد قومی کی بھی میزان تھی اور دیت نام کی روح پرور جدوجہد قومی کی میزان بھی۔ ان دونوں میزانوں میں مجاہدین فلسطین کو پورا اترتے دیکھ کر چین کی انقلاب بدوش اور انقلاب پرور قیادت نے مجاہدین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اور دوستی کا حق ادا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ بے ملک کے مجاہدین کو اس نے اپنے ہاں لے جانے کا سلسلہ شروع کیا اور انہیں تربیت بھی دی اور اسلحہ بھی کیا۔ چین ان مجاہدین کو بدستور تربیت دیئے چلا جا رہا ہے اور اسلحہ دیئے چلا جا رہا ہے۔ عرب اور غیر عرب مسلمان آج تک ان مجاہدین کے تقاضے پورے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ان کی ضرورت کیا ہے؟ چھوٹے ہتھیار، کپڑے، خوراک، دوائیاں۔ یہ ایسی ضرورتیں ہیں جو مسلمانان عالم حکومتی اور غیر حکومتی ذرائع سے بطریق احسن پوری کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر رہے۔ مسلمان ممالک زیادہ سے زیادہ بعض عرب حکومتوں کی مدد کو پہنچ سکے ہیں۔ سرکاری اور باقاعدہ فوجوں کو تربیت اور اسلحہ بہم پہنچایا۔ نظریہ ظاہر کرنے کا کام ہے لیکن یہ فوجیں دشمن سے کم اور آپس میں زیادہ لڑتی ہیں۔ اب یہ فوجیں (لبنان اور اردن میں مثلاً) مجاہدین سے بھی الجھنے لگی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے عناصر حکومت معیشت اور معاشرت میں پیش پیش ہیں جو اپنے عوام سے منہ موڑ کر ان بیرونی عناصر سے رشتہ جوڑے ہوئے ہیں جو نہ عربوں کے بہی خواہ ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔ یہ فلسطین کے حادثے کی برکت ہے کہ قیادت عوام سے ابھرنے لگی ہے۔ یہ قیادت اتنی جری اور بے پناہ ہے کہ اسے کوئی طاقت — کیا اندرونی کیا بیرونی — دبا نہیں سکتی۔ یہ قیادت ابھری تو فلسطین سے ہے لیکن اس کا اثر تمام عالم عرب میں محسوس کیا جانے لگا ہے۔ کئی عرب ملکوں میں سیاست کے دھارے بدل چکے ہیں اور وہ اپنے آپ کو اس نئے بے پناہ دھارے کی رو سے ہم آہنگ کرنے لگے ہیں۔

یہ مجاہدین آنے والے کل کے عرب ہیں۔ مجاہدین سے مراد لڑنے والے گوریلے ہی نہیں عرب عوام بھی ہیں جو تیزی سے

منظم اور بغاوت آمادہ ہو رہے ہیں۔ گوریلا جنگ چند تربیت یافتہ اور کٹن بردوش مجاہدوں کی کارروائی تو ہوتی ہے لیکن ان کی کامیابی کا دارومدار مقامی آبادی کے تعاون پر ہوتا ہے۔ مقامی آبادی گوریلوں کا ساتھ نہ دے تو وہ کبھی مؤثر کارروائی نہ کر سکیں۔ فلسطینی مجاہدین کی کارروائیوں کو دیکھ کر بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام عرب آبادی ان کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دینے لگی ہے، اور یہ بڑی خوش آئند صورتِ حال ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ گزشتہ سال ۲۱ اگست کو مسجد اقصیٰ کو آگ لگائی گئی تو ۲۳ اگست کو مقبوضہ فلسطین میں دس لاکھ فلسطینیوں نے کاروبار بند کر کے مکمل ہڑتال کی۔ حال ہی میں لبنان میں سرکاری فوج نے مجاہدین سے ٹکر لی تو عوام نے لبنان کی شمالی بندرگاہ طرابلس پر قبضہ کر لیا جب تک حکومت نے اپنا رویہ بدل کے مجاہدین سے مفاہمت نہیں کر لی یہ شہر خالی نہیں کیا گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ مجاہدین کے حملے تعداد میں زیادہ اور نوعیت کے اعتبار سے شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر کرامہ کے مقام پر مارچ ۱۹۶۹ء میں مجاہدین نے پندرہ ہزار دشمن فوج کو شکست دی تھی۔ ستمبر ۱۹۶۹ء میں یعنی ایک مہینے میں مجاہدین کے حملوں کی تعداد ۸۶ بتائی گئی ہے اور یہ اندازاً پچھلے چھ ماہ کے حملوں کے برابر ہے۔ بعض حملوں میں مجاہدین کی جمعیت تنظیم میں بہتر اور تعداد میں دشمن سے زیادہ تھی اور انہوں نے خوب نقصان پہنچایا۔ مجاہدین کی قوت کا اب یہ عالم ہے کہ انہی دنوں "الفتح" کے سربراہ یاسر عرفات نے اعلان کیا ہے کہ اردن میں تیس ہزار مجاہدین ایسے ہیں اور اب اسرائیل کو اردن پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہ اعلان اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جارحانہ کامیابی کے بعد یہ عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ اردن اسرائیل کے رحم و کرم پر ہے اور وہ کسی وقت بھی اس پر قابض ہو سکتا ہے۔

یہ بھی مجاہدین کی روز افزوں قوت اور ہمت کی دلیل ہے کہ یاسر عرفات نے حال ہی میں روس کا بھی دورہ کیا اور چین اور شمالی ویت نام کا بھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجاہدین کو ایک عالمی قوت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اور اب یہ ویت نام کے سے حریت پسندوں کا سا مقام حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ مجاہدین اس عالمی انقلابی تحریک سے متعلق ہو گئے ہیں جو ایشیا اور افریقہ اور لاطینی امریکہ میں قومی اور بین الاقوامی طور پر لڑی جا رہی ہے۔ اس قوت اور کامیابی کا نتیجہ ہے کہ متعدد گوریلا تنظیمیں ایک مرکزی قیادت کے تحت آ گئی ہیں۔ اب وہ نام نہاد تنظیمیں اپنی موت آپ مر جائیں گی جو دشمنانِ جہاد نے تحریکِ جہاد کو ناکام بنانے کے لئے کھڑی کر دی تھیں۔

اسرائیل، جس کا دماغ جون ۱۹۶۷ء کی حیران کن کامیابی سے ایسا خراب ہو گیا تھا کہ وہ عربوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اور چلتے چلتے یوں بات کر جاتا تھا جیسے وہ چاہے تو عرب ممالک کو مکمل شکست دے کر اپنے قبضے میں لے لے، اب بدلے ہوئے لہجے میں بات کرتا ہے۔ وہ یہ کہنے پر آ گیا ہے کہ لڑائی لمبی اور تھکا دینے والی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے

بجٹ کا ایک تہائی جنگی تیاریوں پر صرف کرنے پر مجبور ہے۔ اس سے وہ عرب عوام کے غیظ و غضب کا تو کیا مقابلہ کرے گا اس کی اپنی مشکلات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ مالی عدم توازن کا شکار ہے اور اس کا اندرونی سیاسی اضطراب بڑھتا جا رہا ہے۔ یوں تو اسے مسلط بھی سامراج نے کیا اور برقرار بھی سامراج ہی نے رکھا تاہم اب اس کے حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ سامراج کے زیادہ سے زیادہ سہارے کا محتاج ہے۔ یہ سہارا اسے ملے گا اور ملتا جائے گا لیکن یہ سہارا اسے بچا نہیں سکیگا۔ سامراج اور سامراج کا کارندہ 'اسرائیل' دونوں فلسطین میں بے نقاب ہو رہے ہیں اور دونوں عوام کے بے پناہ غضب کا نشانہ بنتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے انجامِ بد کو پہنچ کے رہیں گے ۔

مجاہدینِ فلسطین نے اس صداقت کو پا لیا ہے کہ بقول اقبال ؎

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات

خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

زمانہ شیوخ و سلاطین کی نمود کو دیکھتا رہا اور عربوں کی شکست کے چرچے کرتا رہا۔ امتِ عربیہ میدانِ جنگ میں اتری ہی کب تھی! یہ امت اب میدان میں اترنے لگی ہے۔ اب اس امت کے کردار کا ایک عالم کو پتہ چلے گا اور یہ صداقت ابھر کر عربوں ہی کے سامنے نہیں استحصال کے شکار دنیا بھر کے انسانوں کے سامنے آ جائے گی کہ اصل قوت عوام ہیں۔ وہ بیدار، منظم اور سرگرمِ عمل ہو جائیں تو استعمار اور استحصال کی کوئی طاقت ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتی۔ دشمن ملک کے اندر ہو یا ملک کے باہر عوام کے ہاتھوں شکست کھا کے رہیگا۔ مجاہدینِ فلسطین اسی صداقتِ ازلی کو تازہ تر کر رہے ہیں اور استحصال اور استعمار کے شکار انسانوں کو یہ تابندہ سبق دے رہے ہیں کہ ـــــ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ!

(۔۔۔)

ضرورتِ رشتہ

یو۔ پی کے ایک شریف خاندان کی تین لڑکیوں کے لئے جن کی عمریں علی الترتیب ۲۹، ۲۶، ۲۴ سال ہیں، مناسب رشتے درکار ہیں۔ تینوں لڑکیوں نے بی۔ ایڈ۔ ایم۔ اے تک تعلیم حاصل کی ہے اور تقریباً چار چار سو ماہوار پر ملازم ہیں۔ کراچی سے آنے والے رشتوں کو ترجیح دیجائے گی۔

خط و کتابت کیلئے:- محمد اسلام - ۴ ۱۰۰ - لوئس روڈ نیو ٹاؤن۔ کراچی ۵ سے رجوع فرمائیں

شیر آیا! ——— شیر آیا!!
بالآخر کب تک؟

پاکستان میں طلوع اسلام کا پہلا پرچہ جنوری ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ یہ جنوری اور فروری کا مشترکہ شمارہ تھا۔ اس کے بعد مارچ ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "حاسبیہ نفس" کے عنوان کے تابع ہم نے حکومت کی توجہ اس اہم معاملہ کی طرف منعطف کرائی کہ حکومت کی مشینری میں کچھ ایسے لوگ گھس آئے ہیں جو یہاں بد دلی پھیلاتے اور انتشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر اس پاکستان دشمن عنصر کا ازالہ فوری طور پر نہ کیا گیا تو آگے چل کر ان کا فتنہ ایسی شکل اختیار کر جائے گا جو نہ معلوم کس قدر تباہی کا موجب بن جائے۔

اُسی ماہ قائداعظمؒ نے اپنی ڈھاکہ کی ایک تقریر میں فرمایا۔

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپئے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذب توجہ دعووں سے فریب میں نہ آجائیں۔ (روزنامہ ڈان - کراچی - مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۸ء)

اُسی تاریخ کو کراچی میں وزیر خزانہ ملک غلام محمد (مرحوم) نے ایک پریس کانفرنس کے دوران کہا۔

> مجھے یقین ہے کہ ملازمین کا طبقہ دل کا کھرا ہے۔ لیکن ان پر ایک ایسا طبقہ اثر انداز ہو رہا ہے جو ہماری معاشرتی زندگی کا دشمن اور بیرون پاکستان قوتوں کا آلۂ کار ہے۔ حکومت کو بعض ایسی جماعتوں کی سرگرمیوں کا علم ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ وہ سرکاری ملازمین کو حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے لئے اکسائیں۔ ان میں سے بعض ہمارے معاشرتی نظام کے دشمن اور تشدد آمیز انقلاب کے حامی ہیں۔ . . . ان میں

سے بعض کے متعلق ہمیں ضمنی طور پر معلوم ہے کہ وہ باہر سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔ کوئی حکومت بھی ایسے عناصر کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔ ہمارے ملازمینِ حکومت کو محتاط رہنا چاہیئے۔ کہ وہ اس قسم کے لوگوں کے دامِ فریب کا شکار نہ ہو جائیں۔

(ڈان ۔ ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء)

اس کے بعد وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خان (مرحوم) نے ۱۳ اپریل کو اپنے ایک بیان میں کہا۔

بعض سازشی گروہ (ففتھ کالم) ملازمینِ حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد برآری میں استعمال کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے مشئوم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور سرکشی پیدا کر کے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیں۔ مجھے یقین ہے کہ ملازمینِ حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔ (روزنامہ ڈان۔ ۱۳/۴)

ان بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے مئی ۱۹۵۰ء کے لمعات میں لکھا کہ

اس میں شبہ نہیں کہ ہمارے اربابِ حکومت کی یہ تشخیص بالکل درست ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اپریل کی اشاعت میں بصراحت لکھا تھا، دشمنانِ پاکستان کی فتنہ انگیزیوں کا علاج فقط اس قدر نہیں کہ عوام یا ملازمین سے کہہ دیا جائے کہ ان کی چالوں میں نہ آئیں..... اگر دشمنانِ ملک و ملت سرکاری ملازمین کو گمراہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی سازشوں کا جال کہیں زیادہ وسیع ہوگا۔ ہمیں خوشی ہے کہ حکومت اس قدر ہوشیار ہے کہ اسے ایسی دشمنِ پاکستان جماعتوں کا علم ہے لیکن ہم جاننا چاہتے ہیں کہ اس نے مدافعت کی کیا صورت اختیار کی ہے۔

اس کے بعد کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ حکومت نے اس فتنہ انگیز عنصر کے خلاف کیا کارروائی کی ـــ بات آگے بڑھتی گئی، اور دفاتر میں (WHISPERING CAMPAIGN) شروع ہو گئی۔ اس دوران میں مغربی پنجاب کی حکومت نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ حکومتِ پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں۔ بعض سرکاری ملازمین نے جو جماعتِ اسلامی سے وابستہ تھے امیر جماعت سے استصواب کیا۔ انہوں نے یہ رائے دی کہ یہ حلف اُس وقت تک نا جائز ہے جب تک یہ نظام پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے۔ چنانچہ بعض سرکاری ملازموں نے اس مشورے کے مطابق حلف لینے سے انکار کر دیا اور اُن کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی۔ مثلاً روزنامہ نوائے وقت کی ۲۱ ستمبر ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں یہ خبر

شائع ہوئی۔ کہ

> سول سیکرٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے کہ اس نے حکومت پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظامِ حکومت شرعی ہو۔

معاملہ یہیں تک نہیں رکا۔ نوائے وقت بابت ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کی مجلسِ شوریٰ کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ

> موجودہ حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے۔ اس لئے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔

خود امیر جماعتِ اسلامی نے بھی اس کی صراحت کی کہ

> فوج میں تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے شمولیت کا مشورہ (ارکانِ جماعت کو) ہم صرف اُس صورت میں دے سکتے ہیں، جبکہ حکومت، ریاست اور فوج کے اسلامی ہونے کا دستوری اعلان کر کے، گومگوئی موجودہ حالت کو ختم کر دے۔

اس سلسلے میں نوائے وقت نے اپنی ۳ ستمبر ۱۹۶۸ء کی اشاعت میں ایک اداریہ شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا۔

> جب تک انگریزوں کی حکومت تھی، تو مودودی صاحب کے ہمدرد، معاون، معتقد، سرکاری افسر اور اہل کار، انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے، اور مودودی صاحب نے انہیں نہ روکا۔ نمائشی پروپیگنڈا دوسری چیز ہے۔ لیکن کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون و سرپرست رہے اور مودودی صاحب کو اُن سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریز کا راج تھا، اُس وقت مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لئے فوج میں بھرتی حرام ہے نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ لیکن پاکستان آکر انہوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی متشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر اُن کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ حلفِ وفاداری کے مسئلے پر حکومتِ پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا فتویٰ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔

حکومت کی طرف سے اس کے بعد بھی کوئی محسوس اقدام سامنے نہ آیا لیکن عوام میں یہ خیال پھیلتا چلا گیا کہ جن پاکستان دشمن عناصر کی نشاندہی قائداعظمؒ، وزیر خزانہ اور وزیراعظم نے کی تھی، اگر وہ مختص طور پر جماعت اسلامی نہیں تھی، تو کم از کم اس جماعت کا شمار ان عناصر میں ضرور ہوتا ہے۔ اسی بنا پر لوگوں میں یہ خیال بھی عام ہوتا گیا کہ اس جماعت کے روابط کسی بیرونی طاقت سے ضرور ہیں۔ جب ۱۹۵۵ء میں مودودی صاحب نے کھلے بندوں امریکہ سے کہا کہ اگر وہ مسلمان ممالک میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ مسلمان حکمرانوں سے معاملہ کرے اسے چاہیئے کہ مسلمان قوم کے ساتھ معاملہ کرے۔ (تسنیم بابت ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء)۔ اس سے یہ خیال اور تقویت پکڑ گیا کہ اس جماعت کا رابطہ امریکہ سے ہے۔ لیکن اس کے لئے کوئی مستند ثبوت کسی کے پاس نہیں تھا۔

جب ۱۹۶۳ء میں مودودی صاحب کے خلاف مقدمہ چلایا گیا تو اس سلسلے میں حکومت پاکستان کے وزیر امور داخلہ حبیب اللہ خان نے اعلانیہ کہا کہ حکومت کے پاس اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ جماعت اسلامی کو ایک پاکستان دشمن حکومت سے مالی امداد ملتی ہے۔ لیکن اس کے بعد نہ تو وہ ثبوت ہی پبلک کے سامنے آیا اور نہ ہی اسے عدالت میں پیش کیا گیا۔ ایسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اس قسم کا صحیح اعلان اور اس کے بعد ایسی بے طرح خاموشی سے ملک میں جو تاثر پیدا ہو سکتا تھا وہ ظاہر ہے۔

اب انتخابات کے سلسلے میں سیاسی پارٹیوں نے جو "مادر پدر آزاد" سرگرمیاں شروع کی ہیں ان میں ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کے ضمن میں قریب قریب ہر پارٹی نے دوسری پارٹیوں کے متعلق کہا ہے کہ انہیں بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ ان پارٹیوں کے رہنما اپنی تقریروں اور تحریروں میں اعلانیہ اس الزام کو دہراتے چلے آتے ہیں اور لوگ محو حیرت ہیں کہ اس قدر سنگین الزام کے باوجود حکومت نہ کوئی تحقیق کراتی ہے نہ کسی کا مواخذہ کراتی ہے۔

لیکن بات یہیں نہیں رکی، اس سے آگے بڑھی اور اس مقام تک جا پہنچی جس سے آگے ملکی سیاست میں کوئی اور مقام ہی نہیں۔ یعنی خود صدر مملکت جنرل یحییٰ خان نے بھی فرما دیا کہ انہیں شبہ ہے کہ ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں کو بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر این۔ بی۔ اعوان نے (جو پہلے حکومت پاکستان کے انٹیلیجنس بیورو کے ڈائریکٹر جنرل بنے اور اس کے بعد وزارت داخلہ کے سیکرٹری رہے، انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد) یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ بات ان کے علم میں ہے کہ ملک کی بعض سیاسی پارٹیوں کو بیرونی ملکوں سے امداد ملتی ہے۔ دوسری طرف (ریٹائرڈ) میجر جنرل امراؤ خان نے (جو حال ہی میں جماعت اسلامی کے حلقہ متفقین سے وابستہ ہوئے ہیں) لائل پور کی ایک تقریر میں کہا ہے کہ انہیں خود شبہ ہے کہ بعض پارٹیوں کو بیرونی طاقتوں سے امداد ملتی ہے۔ ادھر سے جماعت اسلامی کے سربراہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ اس امر کی تحقیقات کی جائے کہ وہ کونسی جماعتیں

ہیں جنہیں بیرونی ممالک سے امداد ملتی ہے۔ دوسری طرف سے مسٹر بھٹو نے کہا ہے کہ "آٹھ برس تک مجھے بھی حکومت سے وابستہ رہنے کا موقع ملا ہے اور اگر حالات کے تقاضے کے تحت اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی تو میں بھی بیرونی سرمایہ پاکستان میں خفیہ طریقوں سے بھجوانے کے بارے میں، کئی سربستہ رازوں کا انکشاف کروں گا۔" (حوالوں کے لئے دیکھئے ہفت وار چٹان بابت یکم جون ۱۹۷۰ء۔ مشرق۔ لاہور بابت ۲۰ جون ۱۹۷۰ء اور امروز لاہور بابت ۲۰ جون ۱۹۷۰ء)۔

ایوانِ حکومت سے لیکر موچی دروازہ کے میدان تک سے یہ آوازیں مختلف گوشوں سے بلند ہو رہی ہیں۔ عوام انہیں دانتوں میں انگلی دبائے سن رہے ہیں۔ بیرونی ممالک میں اس کے چرچے ہو رہے ہیں لیکن (ان سطور کی تسوید تک) حکومت کی طرف سے کسی قسم کا کوئی اعلان سامنے نہیں آیا کہ وہ اس باب میں کیا اقدامات کر رہی ہے۔ واضح رہے کہ ملک کے کسی فرد یا کسی پارٹی کے کسی بیرونی طاقت کے ساتھ خفیہ روابط اور مالی اعانت کوئی ایسا الزام نہیں کہ اسے یونہی ہنس کر ٹال دیا جائے۔ یہ ایسا سنگین الزام ہے جس سے بڑا الزام کوئی اور نہیں ہو سکتا ــــ اور اس کے ثابت ہونے کی صورت میں ایسا سنگین جرم جس سے زیادہ سنگین جرم تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ اب خود صدرِ مملکت کی طرف سے بھی یہ اعلان ہو رہا ہے کہ انہیں بھی شبہ ہے کہ بعض جماعتوں کو بیرونی طاقتوں سے مالی امداد مل رہی ہے۔ ہم حکومتِ پاکستان سے یہ دریافت کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ اس کے بعد وہ اس سلسلے میں ضروری تحقیقات اور اقدامات کے لئے کون سی چیز کی منتظر ہے۔

اور ہم ملک کے اُن لیڈروں سے پوچھنا چاہتے ہیں جو پاکستان کے اس قدر بہی خواہ بننے کے مدعی ہیں کہ کیا انہیں اسکا احساس نہیں کہ یہ الزامات کس قدر سنگین ہیں اور انہیں ان کی تحقیقات کے لئے حکومت سے متحدہ طور پر مطالبہ کرنا چاہیئے کہ اگر ملک فی الواقعہ اتنے غداروں سے پٹا پڑا ہے تو آپ کی موجودہ سیاسی سرگرمیوں سے حاصل کیا ہے۔

اور ہم ملک کے عوام سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جب آپ کے سامنے ایک لیڈر کھلے بندوں یہ کہتا ہے کہ اُسے معلوم ہے کہ کس پارٹی کو کس بیرونی طاقت سے مالی امداد مل رہی ہے، آپ اُس سے یہ مطالبہ کیوں نہیں کرتے کہ جب تک تم اپنے اس دعویٰ کو ثابت نہیں کرتے ہم تمہارا ایک لفظ تک سننے کے لئے تیار نہیں۔

اور ہم ملک کے اخبارات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ جب اس قسم کے الزامات کو شہ سرخیوں کے ساتھ اور چوکھٹوں کے اندر شائع کرتے ہیں تو اس کے بعد ان الزام لگانے والوں سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ جب تک آپ اس الزام کو ثابت نہیں کر دینگے، ہم آپ کے متعلق ایک لفظ بھی اپنے اخبار میں شائع نہیں کریں گے۔

آسمان کی آنکھ نے اس سے بڑھ کر حیرت افروز اور عبرت انگیز نظارہ شاید ہی کبھی دیکھا ہو کہ ایک ملک کے بچے بچے کی زبان پر ہو کہ ملک میں ایسی غدار جماعتیں موجود ہیں جن کے روابط خارجی طاقتوں سے ہیں اور ان سے انہیں مالی امداد بھی ملتی ہے اور اسکے بعد اس قسم کے الزام لگانے والے بھی دندناتے پھریں اور جن کے خلاف الزام لگائے جائیں وہ بھی سینہ تانے معتبر بنے رہیں۔ نہ کوئی ان سے پوچھے، نہ ان سے سوال کرے!

ــــــــــ (باقی) ــــــــــ

محترم عبدالحکیم خان، مردان

طلوعِ اسلام کا سبق

[پروانۂ شمعِ قرآنی عبدالحکیم خان اوف مردان کی وفات حسرت آیات کی خبر فروری ۱۹۷۰ء کے طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکی ہے آج اتفاق سے گزشتہ کنونشنز کے خطابات کے مسودات کی ورق گردانی کرتے ہوئے خان صاحب مرحوم کی دو تقاریر کے مسودات ملے جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ ہم ان تحریرات میں سے ایک تقریر اشاعتِ حاضرہ میں زینتِ اوراق کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۹۶۶ء کی کنونشن کے لئے تحریر فرمائی تھی۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ موت کے ہاتھوں ہم کس قدر متاعِ گراں بہا سے محروم ہو گئے ہیں۔ مرحوم کی دوسری یادگار تقریر کسی دوسرے وقت پیشِ خدمت کی جائے گی۔ طلوعِ اسلام]

عزیز بھائیو! میرے اس مقالے کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے سامنے طلوعِ اسلام کی تعلیم کا کچھ وہ حصہ پیش کر دوں جو ہمارے روزمرہ کی زندگی میں اس پر بحث اور گفتگو کے مواقع ملتے ہیں اس مقالے کے تین اجزاء ہو سکتے ہیں۔

۱۔ اس تعلیم کے پیش کرنے کا طریقہ۔

۲۔ سامعین کا اس پر اعتراض — اور

۳۔ ہماری طرف سے اس کا جواب۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ ہر آدمی سے گفتگو کرتے وقت اُس کی علمی سطح کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے پہلی جماعت کے طالبِ علم سے "دو دونے چار" میں باتیں کرنی پڑتی ہیں۔ اور دسویں جماعت والے سے "اے سکویر اِنٹو بی" سکویر ہیں پوچھنا پڑتا ہے۔ اس لئے گفتگو شروع کرنے سے قبل مخاطب کے علم کا اندازہ کرنا نہایت ضروری ہے۔ ورنہ مفید نتیجہ کبھی نہیں نکل سکے گا بحث کا یہ پہلو عموماً ہمارے سامنے رہتا ہے اور اس کا نتیجہ اکثر تسلی بخش نکلتا ہے۔

مُردے کو تلاوت کا ثواب

ایک دفعہ ایک محفل میں مردے کو قرآن کریم کی تلاوت کا ثواب پہنچانے کا ذکر چھڑ گیا۔ اہلِ علم اوسط درجے کے تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم ضابطۂ حیات ہے، اس میں زندہ لوگوں کے لئے زندگی بسر کرنے کے قوانین درج ہیں اس لئے یہ زندہ لوگوں کو سنانا چاہیئے۔ اور پھر اس کا مطلب بھی سمجھانا چاہیئے۔ تاکہ یہ

زندہ لوگ علم و عرفان کے خزانے سے کچھ حاصل کر کے اپنی زندگیوں کو سنواریں یہی ثواب ہے۔ باقی رہا مردہ، تو اُس پر منوں مٹی پڑی ہوتی ہے اُس تک ہماری یہ خفیف آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے۔ وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ۔ (فاطر) یعنے تو ان کو جو قبروں میں ہیں نہیں سنا سکتا۔ اب اگر حضورؐ اپنی بات مردوں تک نہیں پہنچا سکتے تو ہماری کیا حیثیت ہے۔ اِس پر کہا گیا کہ مردہ شاید دوسری باتیں نہ سن سکتا ہو لیکن قرآن کریم تو اللہ کا کلام ہے یہ تو ضرور سنا جا سکتا ہے عرض کیا گیا کہ حضورؐ بھی تو اللہ کا پیغام اور کلام ہی سنا رہے تھے۔ (بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ۔) (ور تھوڑی دیر کے لئے اگر فرض بھی کیا جائے کہ اُس نے قرآن کریم کے الفاظ سن بھی لئے تو کیا حاصل؟ زندگی میں اُسے ان کے معلوم تھے نہ مطلب، اب سن کر کیا فائدہ اٹھائے گا۔ پھر اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ مرنے کے بعد مردہ عربی دان بھی بن جاتا ہے اور قرآن دان بھی، تو اس فہم و دانش کا ما حصل کیا۔ حافظ اُسے سناتا ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ۔ ط اے مومنو! جب تم آپس میں ایک معین وقت تک کچھ لین دین کرنے لگو تو اس کو ضبطِ تحریر میں لایا کرو۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مُردے کو جب یہ آیت سنائی جاتی ہے تو وہ اِس کے عمل پر مکلف ہے؟ آیا وہ وہاں قرض کا کچھ لین دین کر سکتا ہے، ضرورت پڑنے پر مکان یا زمین رہن رکھ کر کچھ رقم کسی سے حاصل کر سکتا ہے۔۔۔؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس آیت اور اِن جیسی سینکڑوں دیگر آیات کے سنانے کا آخر مقصد کیا ہے؟

ایک صاحب بولے کہ خدا کا کلام اگر سنایا جائے تو کیا مُردے کو ثواب بھی نہیں پہنچتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ایک سچا واقعہ بیان کرتا ہوں پھر آپ منصفانہ فیصلہ کریں۔

۱۹۱۹ء میں ایک بڑے خان فوت ہو گئے جس کی نیکیاں صفر کے برابر تھیں۔ اُس وقت سے لے کر اب تک (۱۹۶۶ء) سینتالیس برس ہو چکے ہیں۔ دو حافظ اُس دن سے آج تک قبر کے ہمراہنے بیٹھے تلاوت میں مصروف ہیں اور بقول آپ کے مُردے کو باقاعدگی کے ساتھ ثواب پہنچا رہے ہیں، بخلاف اسکے اسی دن ایک دوسرا غریب آدمی بھی فوت ہو چکا ہے۔ اس کی نیکیاں مثلاً ایک سو تھیں لیکن وارثوں کی ناداری اور تنگدستی کی وجہ سے خیرات اور تلاوت کا کوئی اہتمام نہیں ہے۔ آپ کے نظریئے کے مطابق خان کے ثواب میں موت کے بعد تو روزانہ اضافہ ہو رہا ہے، لیکن غریب کا کھاتہ بند ہے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ خان کا ثواب جمع ہوتے ہوتے صفر سے بڑھ کر کئی سو۔۔۔۔ تک پہنچ جائے گا اور اِس طرح اس بدکردار خان کو ایک نیک کردار غریب پر ثواب کے لحاظ سے کئی گنا فوقیت حاصل ہو جائے گی۔ اب آپ بتائیں کہ

کیا یہ جائز اور عدل و انصاف ہے؟ قرآن کریم کا مُردوں کے بارے میں اٹل فیصلہ ہے۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ یعنی مُردوں کو اُن کے عمل کے نتائج ملیں گے اور تم کو تمہارے عمل کے۔ خیر خیرات اور عمل کا نتیجہ عمل کرنے والے کو ملتا ہے دوسرے کو نہیں۔ بیٹے کی بخشش سے باپ کی صحت اچھی نہیں ہو سکتی ہے۔ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ اچھے عمل کا نتیجہ اچھا ملے گا بُرے عمل کا بُرا ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

اُس وقت تو وہ خاموش ہو گئے اور اُس کے تاثرات مجھے معلوم نہ ہو سکے لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کئی محفلوں میں وہ یہی دلائل دیتے رہے۔

فرشتے اور چوکیدار

میں پچھلی اگست اپنے ایک عزیز دوست اور تحریکِ "طلوعِ اسلام" کے ایک نڈر سپاہی کی دعوت پر اسکے گاؤں گیا۔ انہی دنوں اُن کے ایک گاؤں کا ایک آدمی فوت ہو گیا۔ یہ جمعرات کا دن تھا۔ خیر خیرات کے لئے گھر والوں کو دو سو روپے قرض لینے پڑے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہاں بلا سود کوئی قرض روپیہ نہیں دیا کرتا ہے اور قرض دینے والے بھی صرف دو طبقے ہیں گاؤں کا خان اور گاؤں کا مولوی۔ (پاکستان بننے سے قبل یہ کام ہندو کیا کرتے تھے) گاؤں میں سوائے ان دو لوگوں کے کسی دوسرے کے پاس پیسے ہوتے بھی نہیں اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خیر خیرات کی رقم اور جنس گاؤں کے یہی خان اور مولوی آپس میں تقسیم کر کے ثواب مُردے کو بخش دیتے ہیں۔ وہ بھی خوش یہ بھی خوش ۔ خیر اس قسم کی خُرد بُرد تو ایک جانی پہچانی مکر ہے جو بڑی مدت سے چلی آ رہی ہے لیکن ایک انوکھی بات میں نے وہاں دوسری دیکھی۔ ایک آدمی کو اُسی دن (جمعرات) کو مولوی صاحب کے حکم سے قبر کے پاس بٹھا دیا گیا (وہاں کے مولویوں کا بیان کردہ مسئلہ ہے کہ جب قبر پر بطور چوکیدار آدمی بٹھایا جائے تو فرشتے یعنی منکر نکیر نہیں آ سکتے ہیں) تاکہ سوال و جواب لینے کے لئے فرشتے آج نہ آ سکیں۔ اور کل چونکہ جمعہ مبارک دن ہے جس میں حساب کتاب ہو ہی نہیں سکتا ہے (مولویوں کا یہ مسئلہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ جمعہ کے مردے سے قیامت تک حساب کتاب نہیں لیا جاتا ہے) میرے دوست نے دوسرے دن مولوی صاحب سے پوچھا کہ جب فرشتے اس چوکیدار سے ڈر کر قبر میں نہیں گھس سکتے ہیں تو ملک الموت اتنے زیادہ آدمیوں کی موجودگی میں مُردے کے پاس کیسے آ سکا اور

اُس کی روح قبض کرلی، وہ بھی تو فرشتہ ہی ہے نا ۔ مولوی صاحب نے حسبِ معمول کہا کہ تم لوگ ہر بات میں دین کا مذاق اُڑاتے ہو ـــــ بہت خوب!

؎ برعکس نام زنگی نہند کافور!

نسخہ طلوعِ اسلام

مردان میں ایک ڈاکٹر صاحب پچھلے چند سالوں سے پریکٹس کر رہے ہیں۔ پریکٹس اچھی ہے، مذہب سے بھی انہیں کافی دلچسپی ہے۔ دو تین سال کی بات ہے میرا پروگرام اُن دنوں سے یہ رہا ہے کہ ہر ماہ ایک یا دو رسالے متفرق دوکانداروں کو دیا کرتا ہوں اور پھر چند دنوں کے بعد اُس کے تاثرات معلوم کیا کرتا ہوں۔ یہ طریقہ اچھا ہے اس کے کئی فائدے ہیں۔ مثلاً

۱۔ غور و فکر والے انسان ہمارے ہمنوا بن جاتے ہیں۔

۲۔ ناواقف اس کے متعلق سوچنا شروع کر لیتے ہیں ـــ اور

۳۔ مخالفین پر ایک بار پھر ظاہر ہو جاتا ہے کہ "طلوعِ اسلام" زندہ ہے۔

پروگرام کے مطابق میں اس ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا، جان پہچان تو تھی ہی مریضوں سے فارغ ہو کر میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے کہا کہ آپ روزانہ دوسروں کو نسخے دے رہے ہیں آج میں آپ کو ایک نسخہ دے رہا ہوں اور بغیر فیس کے میں نے پرچہ اُن کی طرف بڑھایا ۔ "طلوعِ اسلام" کا نام دیکھتے ہی ہاتھ واپس کھینچا اور کہنے لگے "مجھے اس سے معاف رکھیں"۔ میں نے بھی ہاتھ روک لیا اور سلام علیکم کہہ کر وہاں سے اُٹھ آیا ـــ اب تین سال کے بعد کوئی دو چار مہینے کی بات ہے کہ ایک نجی مجلس میں اُن سے ملاقات ہو گئی وہ چار پانچ ہم خیال دوست تھے۔ بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھنے لگے۔ "آپ ذرا پرویز صاحب کے خیالات پر روشنی ڈالیں وہ کیا کہا کرتے ہیں؟" . . . .

. . . . میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب! میں نے تو تین سال قبل آپ کی خدمت میں "رسالہ" پیش کیا تھا۔ تاکہ پرویز صاحب کے خیالات سے آپ روشناس ہو جائیں۔ اُس وقت اگر آپ "طلوعِ اسلام" لیکر پڑھتے تو اب پوچھنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ خیر اب بھی خدا کا شکر ہے کہ آپ کی توجہ اس طرف ہو گئی ہے۔ میں نے کہا کہ پرویز صاحب کے خیالات ایک ایک مضمون پر اتنی وسعت سے پھیلے ہوئے ہیں کہ اُن کا احاطہ اس تھوڑے سے وقت میں نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ہاں اگر آپ کسی ایک خاص بات کی وضاحت چاہتے ہوں تو عرض کر دوں گا۔

انہوں نے احادیث کے بارے میں پوچھا۔ میں نے کہا کہ مختصر الفاظ میں پرویز صاحب کا نظریہ یہ ہے۔ کہ حدیث غلط بھی ہو سکتی ہے صحیح بھی۔ اس کی کسوٹی قرآن کریم ہے۔ اگر یہ قرآن کریم کے خلاف نہ ہو تو پرویز صاحب اُسے سر و چشم تسلیم کرتے ہیں وہ کہنے لگے کہ اس قسم کا تجزیہ گذشتہ تیرہ سو سال میں سوائے پرویز صاحب کے اور کسی کو نہیں سوجھا؟ میں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ تو اللہ کا دین ہے اگر اللہ نے یہ سعادت انہیں عطا کر دی ہے تو آپ خفا کیوں ہوتے ہیں۔ سوچنے کی بات یہ نہیں کہ یہ پرویز صاحب کو کیوں سوجھی کسی اور کو کیوں نہیں، بلکہ سوچنے کی چیز یہ ہے کہ حدیث کے بارے میں پرویز صاحب کا یہ نظریہ غور طلب ہے یا نہیں۔ اور پھر یہ کلیہ کہاں تک مبنی بر حقیقت ہے کہ اگر پہلے کسی بات کی تحقیق نہ کی گئی ہو، یا تحقیق کی ضرورت ہی نہ پڑی ہو تو بعد میں اُس کے متعلق سوچنا اور تحقیق کرنا ناقابل معافی جرم ہے؟ کیا آج سائنس کا غلائے اعظم کی فتح اور چاند ستاروں کی تسخیر کی کوشش اس لئے صحیح اور قابل قبول نہیں کہ یہ کام پہلے کیوں نہیں ہوا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کی یہ فرمائش کہ تیرہ سو سال میں پرویز صاحب جیسے کوئی ناقد کیوں پیدا نہیں ہوئے تو گذارش یہ ہے کہ کئی لیک پیدا ہوئے ہیں، لیکن بنو اُمیہ اور بنو عباسیہ اور دیگر ادوارِ ملوکیت و شاہنشاہیت میں قرآن مجبور رہا ہے۔

اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝ (فرقان)

قرآن کریم کو مسلمان نے جکڑ کر باندھ رکھا ہے۔

یہ اوّل تو کوئی پیش کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا اور اگر کوئی پیش کرتا بھی تو اُسے مانتا کون؟ اس سے تو ان کی ملوکیت ختم ہو رہی تھی۔

اس مختصر گفتگو کے بعد وہ جانے لگے البتہ انہوں نے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر لیا۔

اشتراکیت کا لیبل

آج کل سرکاری دفتروں، نیم سرکاری اداروں، عدالتوں، ہسپتالوں غرضیکہ کوئی ادارہ ایسا نہیں جس میں رشوت خوری کی گرم بازاری نہ ہو۔ یہ ہر حساس دل کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی ہے۔ کئی لوگوں کے ناجائز کام رشوت کے طفیل پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتے ہیں اور کئی جائز کام رشوت نہ ملنے کی وجہ سے سالوں تک معلق رہتے ہیں۔ قرآن کریم کا حکم ہے۔ وَلَا تَأْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ۔ (بقرہ) ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے نہ کھاؤ۔ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ ۔ اور نہ اس کے ذریعے حاکموں تک پہنچو لیکن قرآن کریم کو ماننے والے اور اس کو سینے سے لگانے والے اس کے یہ کھلے احکام

پاؤں تلے روندے ہیں اور ان کو اس کا ذرہ بھر احساس نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ ایک وبائی صورت اختیار کرنے کی وجہ سے اکثر سنجیدہ محفلوں میں زیرِ بحث آتا ہے۔ اس کے سبب اور علاج پر باتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی اس میں حصہ لینا پڑتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ملازم کی تنخواہ کی کمی اس کی وجہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ معیارِ زندگی کی بلندی اور وسائل کی محدودیت اس کا سبب ہے، کوئی کہتا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کی کثرت اور آمدنی کی قلت اس کی علت ہے۔ وعلیٰ ھذا القیاس ــــ لیکن ہم کہتے ہیں کہ بڑی بڑی تنخواہوں اور بڑے بڑے وسائل والے بھی اس لین دین میں کسی سے پیچھے نہیں، اس لئے یہ جواب تسلی بخش نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہو جائے، ذاتی ملکیت کے عزائم دفن ہو جائیں اور انفرادی مفاد پرستیاں کالعدم ہو جائیں۔ اور آج اسی وقت رشوت کا جنازہ اٹھ جائے گا ــــ مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ رشوت کی رقم سے ضروریاتِ زندگی پوری نہیں کی جا رہی ہوتی ہیں ــــ بلکہ زمین خریدنی، بڑے بڑے بلڈنگ کھڑے کر کے اُن پر ھٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ لکھنے اور چھوٹے موٹے کارخانے چلانے پر صرف ہوتی ہے۔ جب ذاتی مفاد کی کشش ہی قطع کی جائے تو رشوت لے کوئی کس لئے ــــ جواب میں فوراً کہا جاتا ہے کہ یہ تو اشتراکیت کا نظام ہے۔ ہماری طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہے قرآنی نظام، لیکن قرآن کے ماننے والوں نے جب سے قرآن سے ثواب کا کام لینا شروع کیا ہے، تو اسے بھلا دیا ہے۔ اب ان کی لاعلمی کی یہ کیفیت ہو گئی ہے کہ اپنے اعلیٰ اور ارفع قرآنی نظام کو دوسروں کو منسوب کر رہے ہیں۔ میں نے کہا یہ تو وہی بات ہوئی کہ مثلاً اشتراکی نظام میں جھوٹ بولنا منع ہے لیکن ہمارے مسلمان بھائی عام طور سے جھوٹ بولا کرتے ہیں، اور نیک مقصد کے لئے جھوٹ بولنا تو بقولِ مودودی صاحب واجب ہو جاتا ہے۔ اب اگر ہم جھوٹ کو قانوناً منع کریں تو کیا اسے اشتراکی قانون کہا جائے گا۔

ایسی بحث کا نتیجہ عموماً تسلی بخش نکلا ہے۔

قربانی کا فریضہ

عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے متعلق عموماً بحث ہوتی ہے۔ یہ قربانی عام طور سے ہر آدمی خواہ اس کی استطاعت ہو یا نہ، اسے ایک ضروری فریضہ سمجھتا ہے۔ یہ گوشت اپنے ہی رشتہ داروں کے گھروں میں تقسیم ہوتا ہے۔ میں بھی کئی سال تک اس رسم کا پابند رہا ہوں۔ میرے گھر سے رشتہ داروں کے گھر گوشت جاتا اور ان کے گھروں سے میرے گھر۔ گوشت میں کوئی کمی نہیں آتی کیونکہ بدل کی

بات تھی۔ اب میں نے یہ رسم ختم کر لی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ سوائے میرے ایک بھائی کے اور کسی کے گھر سے گوشت نہیں آتا ہے اور ہر جانب سے یہ اعتراض کئے جاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ اگر تم یہ تقسیم ناجائز سمجھتے ہو تو اپنی قربانی کا سب گوشت فقیروں میں بانٹا کرو۔ دوسرا کہتا ہے تم صاحبِ نصاب ہو تم اس فریضے کو کیوں ادا نہیں کرتے۔ میں اُن سے کہتا ہوں کہ پہلے تو نصاب کی طرف آیئے۔ بقول آپ کے یہ ایک خاص رقم مثلاً پچاس روپے ہیں۔ اگر یہ کسی کے پاس فالتو ہوں اور اس پر ایک سال گذر جائے تو اس پر قربانی واجب ہے۔ اب آپ اس پر غور کریں۔ یہ نصاب تیرہ سو سال سے ہمارے ائمہ کرام کا مقرر کردہ بتایا جاتا ہے۔ کیا تیرہ سو سال قبل امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں پچاس روپے کی اتنی قیمت تھی جتنی آج ہے؟ اس وقت قربانی کے دنبے کی قیمت آٹھ دس آنے سے زیادہ نہیں تھی اور آپ پچاس روپے میں سے یہ بخوشی خرچ کر سکتے تھے۔ لیکن آج اُسی دنبے کی قیمت اسی روپے ہے۔ اب بتایئے، کہ پچاس روپے کا صاحبِ نصاب اسی روپے کا دنبہ تب قربانی کرے گا کہ تیس روپے کسی دوسرے آدمی سے قرض لے۔ کیا اس فریضے اور اس نصاب کو آپ کی عقل درست کہہ سکتی ہے؟ یہ نصاب اس زمانے میں پانچ ہزار روپے ہونا چاہیئے۔!

اس قسم کی بحث معمولی تعلیم یافتہ لوگوں سے کرنے کے بعد کم از کم نصاب کی حقیقت ان کی سمجھ میں آجاتی ہے اور نصاب کے تحت قربانی پر ضرور سوچنے لگ جاتے ہیں۔

پچھلے سال اسی موضوع پر مردان میں ایک فرقے کے بہت سے بزرگ اور انکی جماعت کے مبلغ میاں صاحب سے ـــــ گفتگو ہوئی جب برائے تبلیغ وہ یہاں تشریف لائے تھے (میاں صاحب کئی سال سے غیر ممالک میں تبلیغ کا فریضہ ادا کر رہے ہیں) یہاں اُن کی دو تقریریں ہوئیں۔ رات کے کھانے کا انتظام بھی تھا، جس میں مجھے بھی دعوت دی گئی۔ وقت مقررہ پر ہم چار پانچ دوست وہاں پہنچ گئے۔ میزبان نے میرا تعارف میاں صاحب کے ساتھ نمائندہ "بزمِ طلوعِ اسلام" مردان کی حیثیت سے کیا جسم نے دیکھا کہ میاں صاحب اور اُن کے فرقے کے قریباً بیس تیس چیدہ چیدہ افراد بیٹھے ہوئے ہیں کھانے سے قبل گفتگو کا سلسلہ جاری ہوا۔ ایک مقامی وکیل صاحب نے میاں صاحب سے جو میرِ مجلس تھے پوچھا کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر ہر گلی کوچے میں بلا ضرورت جانور ذبح کرنے کے بجائے اگر ان جانوروں کی قیمت ضرورتمندوں کو نقد دے دی جائے تو کیا یہ قربانی کا بدل ہو سکتی ہے؟ میاں صاحب فرمانے لگے کہ قربانی کے لئے خون بہانا شرط ہے۔ چونکہ نقد رقم میں یہ نہیں ہوتا ہے اس لئے یہ جائز نہیں۔ وکیل صاحب نے اسے تسلیم کر لیا اور خاموش ہو گئے۔ میں چپ نہ رہ سکا۔

گر ببینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

میں نے عرض کیا کہ کسی عمل کو جائز یا ناجائز ٹھہرانے کے لیے ہمیں اللہ تعالےٰ کی طرف سے ایک ضابطہ اور قانون ملا ہے جو قرآن کریم ہے۔ اس لئے جو فیصلہ آپ نے صادر فرمایا، اس کی تائید میں کیا آپ قرآن کریم کا حوالہ پیش کریں گے۔ ان کے ساتھ ایک حافظ بھی تھے۔ حافظ کو سورۃ الحج کی آیت متعلقہ کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ وہ یہ آیت تلاوت کرنے لگے۔

وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ط

یعنے ہم نے ہر امت کے لئے قربانی مقرر کی ہے تاکہ مویشی جو اللہ نے ان کو عطا کر رکھے ہیں ان کو اللہ کے نام کے ساتھ ذبح کیا کرو۔

میں نے کہا کہ قرآن کریم کا اسلوب بیان یہ ہے کہ پہلے ایک عام حکم دیا جاتا ہے۔ پھر اس کی تفصیل دیتے ہوئے حکم کے کئی پہلوؤں کو سامنے لایا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن فرماتا ہے ـــ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ـــ یعنی اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہاں ساری امت سے خطاب ہے۔ لیکن دوسری آیت میں فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اور عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اسی طرح آپ کی پیش کردہ آیت میں امت کو عام حکم دیا گیا ہے۔ لیکن پھر اسی سورۂ حج میں دیگر تفصیلات کے ساتھ امت کے مخصوص افراد کو قربانی کا حکم دیا جاتا ہے، سب کو نہیں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَ اَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ يَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ... ... ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

ملاحظہ فرمائیں، امت میں سے مخصوص افراد کو قرآن کریم مندرجہ ذیل احکام دیتا ہے:۔

(۱) تم حج کے اجتماعات میں شرکت کرنے کے لئے جایا کرو۔

(۲) قربانی کے جانور پر اس طرف سے سوار ہو کر جایا کرو، اور وہاں خوراک کی ضرورت کے پیش نظر انہیں ذبح کیا کرو۔ (اللہ میاں تو کہتا ہے کہ تم اس زندگی میں قربانی کے زندہ جانور پر سوار ہو کر خانہ کعبہ جایا کرو

لیکن مولوی صاحب کہتے ہیں کہ تم قیامت کے دن قربانی کے مُردے جانور پر سوار ہو کر پُل صراط کو عبور کرو گے۔

(۳) اس ذبیحہ کا مقصد یہ ہے کہ خود بھی اس سے کھاؤ اور دیگر ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

(۴) مقامِ ذبح بیت العتیق یعنی خانہ کعبہ ہے۔

میں نے کہا کہ اتنے واضح احکام کے ہوتے ہوئے ہم کہاں تک حق بجانب ہیں کہ ایک تو بلا ضرورت لاکھوں کو ذبح کرتے جائیں اور پھر قرآن کریم کے بتائے ہوئے مقامِ خانہ کعبہ کو چھوڑ کر مردان کی گلی کوچوں میں بے حد و شمار جانور کاٹتے چلے جائیں۔ کیا یہ قرآن کریم کی نافرمانی نہیں؟

میاں صاحب نے میری گزارشات کے جواب میں بس اتنا فرمایا کہ تم لوگ احادیث کے قائل نہیں ورنہ یہ قربانی کی تفصیلات سے بھری پڑی ہیں۔

نعتِ رسولؐ اور لاٹری

کچھ عرصہ قبل میرا معمول تھا کہ میں شام کے وقت ایک سرائے میں جایا کرتا تھا۔ وہاں چند کمیونسٹ قسم کے لوگ بیٹھتے تھے، اُن سے باتیں ہو جاتی تھیں۔ میں اُن کو کبھی پرچہ کبھی پمفلٹ اور کبھی کوئی کتاب مطالعہ کے لئے دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس طرف جاتے ہوئے راستے میں ایک میدان میں کوئی چالیس پچاس کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک اسٹیج بھی سجا ہوا تھا، لاؤڈ اسپیکر بھی فٹ کیا گیا تھا، اور تیس پینتیس آدمی بھی جمع تھے۔ اُن لوگوں کو دیکھ کر میں بھی اُس طرف گیا۔ جب پہنچا تو نعتِ رسولؐ کا ریکارڈ بج رہا تھا۔ ؎

اگر اے نسیمِ سحر تیرا ہو گزر دیارِ حجاز میں!
میری چشمِ تر کا سلام کہنا حضورِ بندہ نواز میں!

اس اثنا میں دریافت کرنے پر معلوم ہو گیا کہ "شہباز" لمیٹڈ کی آج لاٹری نکل رہی ہے۔ یہ سب اہتمام اسی ضمن میں ہے۔ (شہباز اور اس طرح دوسرے ناموں سے کچھ عرصہ قبل "لمیٹڈ جعلی کمپنیاں" وجود میں آئی تھیں۔ اس کے ممبر پانچ روپے ماہوار چندہ دیا کرتے تھے۔ مہینے میں ایک بار لاٹری نکالی جاتی تھی جس کے نام لاٹری نکل آتی اُس کو پانچسو روپے دیئے جاتے تھے۔ دو چار آدمیوں کو روپے دینے کے بعد جب خوب شہرت حاصل ہوئی اور ممبروں سے کافی رقم ہاتھ آئی، تو یہ کمپنیاں غائب ہو گئیں)، جب ریکارڈ ختم ہو گیا تو مجھ سے نہ رہا گیا، جلسے کے منتظم سے کچھ بولنے کی اجازت مانگی۔ اُس نے ناواقفیت میں بڑی خوشی

سے مجھے اسٹیج پر بلایا اور لاؤڈ اسپیکر میرے سامنے کر دیا۔ میں نے کہا بھائیو! مجھے بہت افسوس ہے کہ تم یہاں جوئے اور حرام کی کمائی کے نتائج کے سلسلہ میں جمع ہوگئے اور پھر اس ناجائز اجتماع میں شمولیت کی دعوت دیتے ہو حضور کے نام سے۔ بہت سارے فلمی فحش ریکارڈ بازار میں موجود ہیں جو اس مجلس کے مناسب حال ہیں۔ ان کو کیوں نہیں بجایا کرتے۔ تم لوگ روپوں کے لالچ میں حضور کا بھی مذاق اڑانے لگ گئے ہو۔ سب نے شور مچایا، لاؤڈ اسپیکر میرے سامنے سے ہٹایا، لڑنے جھگڑنے تک نوبت پہنچ گئی۔ لیکن چند جان پہچان کے آدمی بیچ میں آگئے اور بات آگے نہیں بڑھی، منتظم صاحب بہت غصے کی حالت میں مجھ سے کہنے لگا، تمہیں معلوم ہے ہمارے پاس اس کاروبار کے لئے حکومت کا لائسنس ہے۔ میں نے کہا ٹھیک ہوگا۔ لیکن حکومت کے لائسنس سے کبھی حرام چیز حلال نہیں ہو سکتی ہے۔ کیا لائسنس کے ذریعہ عصمت فروشی جائز ہو جاتی ہے؟

یہ کہہ کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ دوسرے دن جب سرائے کی طرف جا رہا تھا تو سرائے کے پاس ایک دکاندار دکان سے اٹھ کر میرے پاس آیا اور میرے کل کے واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے میرے ہاتھ چوم لئے اور رقت آمیز لہجے میں میری درازی عمر کی دعا کی۔

یہ میرے لئے کافی تھا۔ میں سمجھا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

کراچی سے درس قرآن

میں کئی سالوں سے صبح کے وقت کراچی سے درس قرآن سنا کرتا ہوں۔ کچھ عرصے کی بات ہے ریڈیو پر ایک مفتی صاحب درس دے رہے تھے۔ زیر درس سورۂ یوسف کی یہ آیتیں تھیں — وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهِ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا أَن رَّأَىٰ بُرْهَانَ رَبِّهِ ۚ۔ اس کی تفسیر میں فرمانے لگے کہ اس آیت میں ایک لفظ برہان آیا ہے جس پر سابق مفسرین نے کافی روشنی ڈالی ہے اور یہ ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔ برہان کے دو مفہوم ہیں۔

پہلا مفہوم —— جب حضرت یوسف علیہ السلام بھی عزیز مصر کی بیوی کی خواہش پورا کرنے کے لئے (استغفراللہ) تیار ہو گئے تو اس اثنا میں جب ان کی نظر سامنے کی دیوار پر پڑی تو ان کو اپنے والد کا شبیہ نظر آیا، جو خفگی اور پریشانی کے عالم میں ان کی طرف دیکھ رہے تھے اور انگلی ہلا ہلا کر ان کو منع فرما رہے تھے۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام یہ دیکھ کر پشیمان ہو گئے اور اپنے ارادہ سے باز آئے۔

دوسرا مفہوم —— جب عزیز مصر کی بیوی اور حضرت یوسف علیہ السلام اس اختلاط کے لئے تیار ہو گئے تو عزیز مصر کی بیوی نے اس بت کو کپڑے سے ڈھانپا جو وہاں نصب تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب یہ دیکھا

توان کو بھی غیرت آ گئی اور کہنے لگے کہ جب عزیز مصر کی بیوی کو ایک بُت سے شرم آتی ہے جو نہ دیکھ سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے تو مجھے اُس خدا سے کیوں شرم نہ آئے جو بصیر بھی ہے اور سمیع بھی۔ چنانچہ حضرت یوسفؑ نے انکار کیا۔ (استعاذباللہ) ھٰ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

یہی وہ تفسیر جو مفتی محمد شفیع صاحب اپنی زبانِ فیض رسان سے کی اور ریڈیو پاکستان، کراچی نے اُسے ساری دنیا میں نشر کرنے کی سعادت حاصل کی۔

میں نے ریڈیو کراچی کو مفتی صاحب کی اِن گمراہ کن اور دور از کار تاویلات کے متعلق لکھا۔ میں نے کہا کہ قرآن کریم تصریفِ آیات کا اصول بتاتا ہے اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ۔ (انعام ۶۵) اس اصول کے تحت اگر مفتی صاحب تھوڑی تکلیف کرتے اور بُرہان کا لفظ قرآن کریم میں دوسرے مقام پر دیکھ لیتے تو اسرائیلیات کے اِن عقل سوز اور حیا سوز قصے کہانیوں کے پیش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں نے لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کو کئی اسماء سے موسوم کر کے ہماری راہ نمائی کی کوشش کی ہے کہیں نُوْرٌ مُّبِيْنٌ کہا ہے، کہیں بَصَائِرُ لِلنَّاسِ کہا ہے، کہیں هُدًى وَّرَحْمَةٌ ہے۔ اور کہیں ذِكْرٌ وَّمَوْعِظَةٌ ہے اور اسی طرح دیگر کئی نام ـــــ انہی ناموں میں قرآن کا ایک نام بُرہان بھی ہے۔ يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ (مائدہ ۱۱۵) ـــ یعنی اے دنیا کے لوگو تمہاری ربوبیت کرنے والے کی طرف سے تمہارے پاس بُرہان آئی ہے جو سراسر نور ہے۔ دوسرے مقام پر اسی نور کو کتاب بھی کہا ہے ـــ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ (مائدہ ۱۵) اس سے صاف معلوم ہوا کہ بُرہان کا مطلب ہے وحیِ الٰہی، قانونِ الٰہی، احکامِ الٰہی اور ضابطۂ الٰہی وغیرہ ـــ اگر مفتی صاحب قرآن کی رُو سے یہی مطلب پیش کرتے تو حضرت یوسفؑ کی عصمت بھی اِن کے ہاتھوں بچ جاتی اور خود قرآن کریم کی بدنامی بھی ان کی زبان سے نہ ہوتی۔

اب ملاحظہ فرمایئے وہ ترجمہ جو ترجمہ بھی ہے، مفہوم بھی ہے اور تفسیر بھی ـــ جو ہمیں طلوع اسلام نے دیا ہے۔ "......لکھا ہے کہ عورت حضرت یوسفؑ کے پیچھے پڑ چکی تھی اور (حالت ایسی ہو گئی تھی کہ بے قابو ہو کر) حضرت یوسفؑ بھی اُس کی طرف متوجہ ہو جاتا اگر اُس کے سامنے اپنے پروردگار کا یہ اخلاقی قانون نہ ہوتا"

مجھے اس کا جواب حسبِ معمول اُن سے موصول نہ ہوا۔ حسبِ معمول اس لئے کہ میں نے اس سے قبل بھی کئی بار قرآن کریم کی ایسی گمراہ کن "توضیحات" پر اُن کو متنبہ کیا تھا اور جواب نہیں ملا تھا۔ لیکن مجھے اطمینان ہوا کہ

میں نے اپنا فریضہ ادا کیا۔

ابجد اور قرآن شریف

آخر میں اپنے ایک محترم پروفیسر صاحب (جو کالج کے زمانے میں میرے پروفیسر تھے) کے ایک اخباری مضمون کے متعلق لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے اخبار "شہباز" میں ایک طویل مضمون پشتو میں بعنوان "سید عبدالقادر جیلانی اور قرآن شریف" لکھا۔ فرمانے لگے "ایک دن قرآن کی تلاوت کر رہا تھا سورۂ کہف میں جب میں وَلَنْ تَجِدَ لَهُ وَلِيًّا مُّرْشِدًا کے مقام پر پہنچا تو میں اس ٹکڑے پر غور کرنے لگا کہ یہاں ولی اور مرشد کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ چنانچہ اس ہستی کو معلوم کرنے کیلئے میں نے وَلِيًّا مُّرْشِدًا کے عدد ابجد کے حساب سے معلوم کئے تو یہ ۹۷۷ نکلے۔ پھر عبدالقادر جیلانی کے عدد نکالے تو یہی ۹۷۷ نکلے۔ پس مجھے یقین ہو گیا کہ اس آیت میں ولی اور مرشد کا اشارہ سید عبدالقادر جیلانی کی طرف ہے۔"

کیا خوب! ع

اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی!

میں نے اسی اخبار میں دوسرے دن پشتو میں پروفیسر صاحب کے جواب میں لکھا کہ کیا ابجد کا حساب کتاب ایسا ہی مستند ہے جیسا کہ خود قرآن شریف، اور کیا قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آیتوں کے عدد نکالے جائیں اور پھر کسی پیر فقیر کے نام پر منطبق کر کے اصلی ولی اور مرشد کا سرٹیفیکیٹ دے دیا جائے۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک پروفیسر کو زیب نہیں دیتا کہ ایسی لایعنی اور بے مطلب باتوں کے پیچھے پڑ جائے۔ علاوہ ازیں اس کا کیا ٹھکانا ہے اگر کل کو معین الدین اجمیریؒ کا کوئی مرید اُن کے نام کے عدد نکالنا شروع کر دے۔ اور کھینچ تان، جمع تفریق سے ۹۷۷ برابر کر جائے تو پھر اصلی و نقلی ولی و مرشد کا فیصلہ غالباً قرعہ اندازی سے کیا جائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

"پیراں نمی پرند مریداں می پرانند"

میں نے اپنے طویل مضمون میں "طلوع اسلام" کی قرآنی بصیرت کی روشنی میں اولیاء اللہ پر بھی بحث کی اور آخر میں لکھا کہ آپ اپنے آپ اور عوام پر رحم نہیں کرتے تو کم از کم عبدالقادر جیلانی پر رحم کریں کیونکہ ان کو بھی آپ کے اس غلط اور بے بنیاد دعوے کی صفائی میں قیامت کے دن پیشی دینی پڑے گی اور اپنی صفائی میں ان کو کہنا پڑے گا۔ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ (۵/۱۱۶) تیری ذات پاک ہے۔ یہ مجھ سے کیونکر ہو سکتا ہے کہ میں تیری شان میں

وہ بات کہوں جو میرا حق نہیں۔

میں کافی دنوں تک اخبار میں ان کے جواب کا منتظر رہا لیکن بے کار۔ البتہ مجھے کئی ایک خطوط نامعلوم حضرات سے ملے جنہوں نے میرے خیالات کی تائید کرکے میری ہمت بڑھائی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک پروفیسر کی یہ کیفیت ہو تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے آن پڑھ اور کم تعلیم یافتہ عوام کس قدر پیروں، فقیروں اور قبروں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ ؎

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پوچھ

طلوعِ اسلام کی برکات

اللہ کے حضور میرا سر بے اختیار جُھک جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے "طلوعِ اسلام" کے میرِ کارواں کی درازیٔ عمر کے لئے دعا نکلتی ہے کہ اُن کی قرآنی تعلیم و بصیرت نے مذہب کے کتنے تاریک اور دبیز پردوں کو ایک ایک کرکے ہٹا دیا۔ اور قرآنی نور و تجلّے سے اس تیرہ و تار راستے کو کس طرح منور کر لیا۔ اِن پردوں میں کہیں مرشد و پیر کا بُت تھا، تو کہیں مُلّا و فقیر کا ـــ کہیں مزار پرستی تھی تو کہیں شخص پرستی۔ کہیں درد وظیفوں کے گورکھ دھندے تھے تو کہیں تسخیر و عملیات کے پھندے کہیں کسی مست قلندر کی بددعاؤں کا خوف و ہراس تھا، تو کہیں صاحبِ جُبّہ و دستار کی دعاؤں کی آس ـــ غرض تین سو ساٹھ بت تھے جو ہمارے اِس چھوٹے سے کعبۂ دل پر مستولی اور قابض ہو چکے تھے: "طلوعِ اسلام" نے نہ صرف ہمارے قلوب و اذہان کو اس سے پاک و صاف کیا بلکہ ایک اللہ یعنی توحید کے سبق سے بھی لبالب بھر دیا اور پھر کمال یہ ہے کہ اتنے بتوں کے توڑنے والے نے اپنے ... بُت کو ہمارے دلوں کے کسی گوشے میں نصب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ بار بار کہتا رہا کہ جو کچھ میں لکھتا ہوں اُسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھو اگر وہ اسے صحیح کہے تو صحیح ورنہ غلط۔

یہ ہے بھی درست ـــ صرف قرآن کریم کا بتایا ہوا راستہ صحیح ہو سکتا ہے۔ صرف اُس کا سہارا قابلِ اعتماد ہے۔ دیگر سب سہارے عین وقت پر فریب دے جاتے ہیں۔ ؎

تمام عمر سہاروں پہ آس رہتی ہے ؛ تمام عمر سہارے فریب دیتے ہیں

قرآنی زندگی

آخر میں اتنا مزید عرض کرتا ہوں اور یہی ہے غرض میرے اِس مقالے کا کہ ایک صحیح راہ کا معلوم کر لینا

اُس وقت تک مفید نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس پر چل کر منزل مقصود تک پہنچنے کی کوشش نہ کی جائے۔

ہمیں اب "طلوع اسلام" کے ذریعہ دین کا صحیح اور مستقیم شاہراہ معلوم ہو گیا ہے۔ کرنے کا کام اب یہ ہے کہ اس راہ کو عملاً اختیار کیا جائے اور اس پر چل کر منزل پر پہنچنے کی کوشش کریں۔ پیاسے کو اگر پانی کی موجودگی کا علم ہو لیکن وہ اٹھ کر پانی پینے کی سعی نہیں کرتا ہے تو محض پانی کی موجودگی کا علم اُس کی پیاس نہیں بجھا سکتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ "طلوع اسلام" کا ہر رکن قرآن کریم کے احکام کا جیتا جاگتا عملی نمونہ ہو۔ ہر عمل میں، ہر فعل میں، وعدہ وعید میں، یاس و امید میں، کامرانی کی تجلیات میں یا ناکامی کی ظلمات میں ـــ غرض جو حال بھی ہو ہمارا قدم قرآن کریم کی صراطِ مستقیم سے ہٹنے نہ پائے۔ "طلوع اسلام" کا رکن اپنے گاؤں، اپنے شہر، اپنے محلہ، اور اپنے حلقہ میں ہر آدمی سے سنوائے اور کہلوائے کہ یہ آدمی جھوٹ نہیں بول سکتا۔ کیونکہ یہ "طلوع اسلام" کا رکن ہے۔ یہ دھوکا اور فریب نہیں دے سکتا ـــ کیونکہ یہ "طلوع اسلام" کا ممبر ہے۔ یہ رشوت، حرام اور دوسروں کا مال نہیں کھا سکتا ـــ کیوں کہ یہ "طلوع اسلام" کا خریدار ہے ـــ یہ بے حیائی کا فعل نہیں کر سکتا ـــ کیوں کہ یہ "طلوع اسلام" سے وابستہ ہے؛ یہ اپنے قول و عہد سے ہٹ نہیں سکتا ہے کیونکہ یہ طلوع اسلامی ہے اور آخر کار یہاں تک کہے کہ یہ قرآن کا مکمل تابعدار ہے کیوں کہ یہ "پرویزی" ہے۔ اگر یہ اعزاز ہم میں سے کسی کو نہ ملے تو یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ ہمارا عمل نہ قرآنی ہے اور نہ ہم "طلوع اسلامی" ہیں

ہر آنکہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

اگر ہمارا مطلب صرف برائے نام طلوع اسلامی کہلوانا ہو، قرآن قرآن کے الفاظ صرف ہماری زبان تک ہوں، پرویز صاحب کی تصنیفات کا مطالعہ صرف ہماری دماغی عیاشی تک محدود ہو، کنونشن سے صرف سیر و تفریح کا مقصد لوپورا کرانا ہو، تو برادرِ عزیز! ؎

ایں راہ کہ تو می روی بترکستان است

اس سے بہتر یہ ہے کہ آپ اس تحریک سے علیحدگی اختیار کریں۔ یہ آپ کے لئے بھی مفید اور تحریک کے لئے بھی سود مند۔ اگر ایک مسلک سے علی وجہ البصیرت انکار کیا جائے تو یہ اتنا قابلِ مواخذہ جرم نہیں لیکن زبان سے اقرار اور دل سے انکار بڑی سخت خیانت ہے اور ضمیر کشی ہے۔ ؎

منکرِ حق نزدِ ملا کافر است
منکرِ خود نزدِ من کافر تر است

بابُ المراسلات

زمانے کے تقاضے اور قرآن

محرم ایجنسی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ سیارہ ڈائجسٹ کے قرآن نمبر (۲) کا مطالعہ کر رہا تھا کہ، اُس میں جناب ..... کا ایک مفید مضمون بعنوان قرآن کی تصویر (؟) نظر سے گزرا۔ وہاں پر انہوں نے ایک محترم بزرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے الحق کے یہ معنی کئے ہیں کہ حق وہ جو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے (لغات القرآن جلد دوم میں نے نکالی تو وہاں پر بھی یہ عبارت ملی) معلوم ہوا کہ محترم بزرگ سے ان کا مطلب آپ ہیں۔ یہ سطور اس شبہ کو دور کرنے کا باعث بنے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن الحق ہے اور زمانے کے تقاضے تو کبھی غلط اور کبھی درست ہوتے ہیں۔ تو غلط تقاضے قرآن کس طرح پورے کرے گا۔ صاحب مضمون نے کہا ہے کہ حق زمانے کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دیتا، بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ حق کے مطابق چلے، لہٰذا بذریعہ طلوعِ اسلام اس اہم بات کو واضح کر دیں۔

جواب: ۔ میں نے نہ تو سیارہ ڈائجسٹ کا قرآن نمبر دیکھا ہے اور نہ ہی محولہ بالا مضمون میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن صاحب مکتوب نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے اس کا ازالہ ضروری ہے ـــــ ان امور کی وضاحت پہلے بھی متعدد بار کی جا چکی ہے۔ بایں ہمہ ان کی مزید وضاحت فائدے سے خالی نہیں ہوگی۔

لغات القرآن کے بارے میں پہلی بات یہ سمجھ لینی چاہیئے کہ میں نے اس میں کسی لفظ کے معنی اپنی طرف سے نہیں دیئے۔ تمام معانی عربی زبان (بالخصوص قرآن کریم) کی مستند کتب لغت کی رُو سے دیئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے ساتھ ماخذ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ جہاں تک لفظ حق کا تعلق ہے۔ میں نے اس کے معانی صرف صرف یہی نہیں دیئے کہ وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا کرتا ہے بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ حق اپنے مقام پر محکم، اٹل اور امٹ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ حق باطل کی ضد ہوتا ہے۔ اتنی سی بات سے ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جو چیز باطل کی ضد ہو وہ باطل کا ساتھ کس طرح دے سکتی ہے۔

امام راغب نے حق کے معانی کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے۔

الحق (حق) کے اصل معنی مطابقت اور موافقت کے ہیں۔ جیسا کہ
دروازے کی چول اپنے گڑھے میں اس طرح فٹ آجاتی ہے کہ وہ سہولت
کے ساتھ اس میں گھومتی رہتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مثال ایسی برجستہ ہے کہ اس سے اصل مفہوم ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔ دیوار اپنے مقام پر محکم ہوتی ہے لیکن وہ بدلنے والے حالات کا تقاضا پورا نہیں کرتی۔ اس کے برعکس دروازے کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقام پر محکم بھی ہوتا ہے لیکن دیوار کی طرح جامد نہیں ہوتا۔ جب آپ اندر آنا یا باہر نکلنا چاہیں تو وہ کھل جاتا ہے اور جب آپ چاہیں کہ نہ کوئی اندر آسکے اور نہ باہر جاسکے تو وہ بند کیا جاسکتا ہے۔ اسے کہتے ہیں بدلتے ہوئے حالات کا تقاضا پورا کرنا۔

اب دیکھئے کہ قرآن کریم کی نسبت سے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اسے دو تین مثالوں سے سمجھئے۔

(۱) قرآن کریم میں ہے کہ نماز سے پہلے وضو کرو۔ اور دوسری جگہ ہے کہ جب پانی نہ ملے یا بیماری کی حالت ہو تو وضو کی بجائے تیمم کرو۔ آپ نے دیکھا کہ بدلنے والے حالات کے مطابق قرآن کریم نے خود ہی دو الگ الگ حکم دے دیئے۔ اپنے اپنے حالات میں دونوں احکام حق ہیں۔

(۲) قرآن کریم میں مخالفین کے متعلق کہیں یہ کہا گیا ہے۔ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ (انہیں معاف کردو۔ ان سے درگذر کرو اور کہیں کہا گیا ہے۔ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ۔ انہیں جہاں پاؤ قتل کردو۔ یہ دو احکام بظاہر ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن اپنے اپنے مقام پر دونوں حق ہیں۔ جہاں حالات کا تقاضا درگزر کرنے کا ہو وہاں درگزر کرنا حق ہے اور جہاں اُن کے خلاف جنگ کرنا ضروری ہو وہاں جنگ کرنا حق کا تقاضا ہے۔

(۳) اپنی مملکت کی سرحدوں کو دشمن کے خطرات سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ "امکان بھر اپنی تیاری رکھو۔ اور سرحدوں پر گھوڑوں کے رسالے متعین کرکے ان کی حفاظت کرو" (۸/۶۰)

ظاہر ہے کہ یہاں اصل مقصد اپنی مملکت کی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے جب تک یہ حفاظت گھوڑوں کے رسالوں سے ممکن تھی، یہی طریق حق کا تقاضا تھا۔ آج کے زمانے میں یہ تقاضا توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ اب یہ طریق اختیار کرنا حق ہے۔

(۴) اوپر کی مثال میں ایک طریق کار (گھوڑوں کے رسالوں) کا تعین قرآن نے خود کر دیا ہے لیکن قرآن کریم کے بیشتر احکامات ایسے ہیں جن میں صرف ایک اصول دیا گیا ہے۔ ان اصولوں کی عملی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ مثلاً اسلامی نظام کے متعلق اُس نے اصولاً کہا ہے۔ وامرهم شورىٰ بينهم (۴۲/۳۸) یعنی ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ مشاورت کا کوئی طریقہ قرآن نے متعین نہیں کیا۔ اس سے

مقصود یہ ہے کہ یہ طریقہ اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق، امت خود تجویز کریگی۔ اور ہر وہ طریق جس سے مشاورت کا مقصد حاصل ہو جائے حق کا تقاضا پورا کرے۔ حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خلافت کے انتخاب میں مشاورت کا طریق اور تھا، آج اس کا طریقہ اور ہو گا۔ بالفاظِ دیگر جس طریق سے مشاورت کا مقصد پورا ہو گا، وہ الحق ہو گا اور جس طریق سے مشاورت کی نفی ہو گی وہ باطل ہو گا۔

ان مثالوں سے آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ ایسا کہنے کا مفہوم کیا ہے کہ حق بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ حق، باطل کا ساتھ دیتا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ حق ایک اصول دیتا ہے اور اس اصول پر عملدرآمد زمانے کے تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی وقت اس اصول کو نظرانداز کر دیا جائے یا بدل دیا جائے تو وہ پروگرام باطل ہو جائے گا۔ اسکے برعکس اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اس اصول پر عمل کرنے کے لئے جو طریق کسی زمانے میں وضع ہوا تھا وہ غیر متبدل ہے اور خواہ وہ زمانے کے تقاضے پورے کرے یا نہ کرے، ہمیں اسی کے مطابق عمل کرنا ہو گا، تو یہ تصور بھی حق کے مفہوم کے خلاف ہے۔ قرآن کے اصول تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو جزئی قوانین وضع اور اختیار کئے جائینگے، جب زمانے کے حالات مقتضی ہوں، تو ان میں تبدیلی کی جا سکے گی۔ دروازہ اپنے مقام پر قائم رہیگا۔ حالات کے مطابق اُسے بند کیا جائیگا اور جب ضرورت پڑے کھولا جائے گا۔ اگر دروازہ جامد ہو جائے تو وہ دروازہ ہی نہیں رہتا۔ یوں اسلام کا نظام اپنے مقام پر اٹل اور محکم بھی ہے اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ بھی دیتا ہے۔ زمانے کو بے شک پھر پھرا کر قرآنی اصولوں کی طرف آنا ہے۔ لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہی ہوا جائے گا۔ اقبالؔ نے اسی کو ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے تعبیر کیا ہے۔ دروازہ کی مثال سے یوں سمجھئے کہ دین کھلنے اور بند ہونے والا دروازہ ہوتا ہے اور جب وہ بند ہو کر منجمد ہو جاتا ہے تو اُسے مذہب کہا جاتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان تصریحات سے بات واضح ہو گئی ہو گی۔ میں اس موضوع پر زیادہ تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ چیز فرصت کی محتاج اور منتظر ہے۔

(پرویز)

(پرویز)

معذرت

طلوع اسلام کالج کے لئے عطیات کی فہرست جگہ کی قلت کی وجہ سے زیر نظر شمارہ میں شائع نہیں کی جا سکی۔ ہم معطی حضرات سے معذرت خواہ ہیں۔

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

حقائق و عِبر

۱۔ صحیح علاج

ذیل کی خبر ملاحظہ فرمائیے۔

"صدرِ مملکت جنرل جان اونگینا نے گزشتہ رات ارجنٹائن کے ممتاز اخبار "لاکرونیکا" کو بند کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ اس اخبار پر الزام یہ ہے کہ اُس نے کورڈوبا میں پولیس اور طلبار کے درمیان تصادم میں ایک طالب علم کی موت کی غلط خبر شائع کی تھی جس سے ملک کی فضا مکدر ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ صدر نے اس الزام میں متعدد دیگر اخبارات اور رسالوں کی اشاعت عارضی طور پر روک دی ہے" (بحوالہ امروز۔ ۲۵/۵)

اے کاش، اس قسم کے احکام کا اجرا پاکستان میں بھی ہو سکتا! اس میں شبہ نہیں کہ اس طرح یہاں کے قریب قریب تمام اخبارات ہی بند کرنے پڑیں گے لیکن فضا کے تکدّر کو دور کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

———— (۰) ————

۲۔ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

روزنامہ امروز کی ۲۷ مئی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

جماعتِ اسلامی مشرقی پاکستان نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی نجات صرف اُن کے لئے جداگانہ وطن کے قیام میں ہے۔

آج سے تیس سال پہلے جب یہی آواز مسلم لیگ اور اُس کے قائد کی طرف سے بلند کی جاتی تھی تو یہی جماعتِ اسلامی اس آواز کا گلا گھونٹنے کے لئے، ایڑی چوٹی کا زور لگاتی تھی اور اس نظریئے کو کافرانہ اندازِ زیست سے تعبیر کرتی تھی۔ اب تیس سال کے بعد ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات ان کے جداگانہ وطن ہی میں مضمر ہے۔

لیکن یہ جماعت مسلم لیگ کی اُس آواز کو اب بھی کافرانہ ہی کہے جائے گی۔ کیونکہ وہ اِن کی طرف سے بلند نہیں ہوئی تھی۔